جذبِ کامل

حضرت خواجہ محبوبِ الٰہی اور حضرت امیر خسرو

تالیف

ڈاکٹر محمد عبداللطیف

ایم۔اے۔پی۔ایچ۔ڈی

جذبِ کامل

حضرت خواجہ محبوبِ الٰہیؒ اور حضرت امیر خسروؒ

قائم شد ۱۹۱۰ء
عباسی کتب خانہ
جونا مارکیٹ کراچی ۲
فون 234882

جذبِ کامل

حضرت خواجہ محبوبؒ الٰہی اور حضرت امیر خسروؒ

تالیف

ڈاکٹر محمد عبداللطیف

ایم۔ اے۔ پی۔ ایچ۔ ڈی

انتشارات

پیکجز لمیٹڈ، فیروز پور روڈ، لاہور

MASOOD FAISAL JHANDIR LIBRARY
Acc No. 040514
MAILSI

TECHNICAL SUPPORT BY
CHUGHTAI
PUBLIC LIBRARY

ناشرین : پیکجز لمیٹڈ، لاہور (پاکستان)
چاپ کنندہ : پاکستان انٹرنیشنل پرنٹرز، جی ٹی روڈ، لاہور

طبع اوّل : اگست ۱۹۷۵
تعداد : ۳۰۰۰

بِاسْمِ سُبْحَانَہٗ

پیش لفظ

امیر خسروؒ کو خواجہ نظام الدین اولیاؒ محبوب الٰہیؒ سے وہی نسبت تھی جو مولانا رومؒ کو شمس الدین تبریزیؒ یا مولانا عراقیؒ کو خواجہ بہاؤالدین زکریا ملتانیؒ سے تھی۔ وہ کاملاً مُرشد کے رنگ میں رنگے جا چکے تھے ـــــ مکمّل وحدتِ خیال۔ کامل یک رنگی و ہم آہنگی تھی ـــــ اِک جذبِ کامل ـــــ اور مرتبۂ فنافی الشّیخ کے حامل ـــــ

بہت دِنوں سے دِلی آرزُو تھی کہ اِس جذب و استغراق پر ایک سیر حاصل تبصرہ لکھوا کر مُستقل کتابچہ کی شکل میں شائع کرایا جائے۔ گورنمنٹ آف پاکستان نے امیر خسروؒ کی ہفت صد سالہ برسی کے وسیع پیمانہ پر انعقاد کا اِہتمام کر کے اس آرزُو کی تکمیل کے سامان فراہم کر دیے ـــ مجھے دلی خوشی ہے کہ پروفیسر ڈاکٹر محمّد عبدُاللّطیف نے ہماری اِستدعا پر اس فریضہ کو اپنے ذمّہ لیا اور میں سمجھتا ہُوں کہ وہ اس ذمّہ داری سے بطریقِ احسن عُہدہ برآ ہوئے ـــ اُمّید ہے کہ وہ عِلمی، ادبی اور رُوحانی حلقوں سے اس کاوش پر خاطر خواہ داد پائیں گے۔

سیّد بابر علی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

عطاکُن "شورِ رُومی" "سوزِ خُسرو"

علامہ اقبال کا یہ مصراع پڑھتے ہی ذہن پر معاً یہ سوال اُبھرتا ہے کہ امیر خسرو کا یہ سوز و گداز کہ اقبال بھی ہے جس کی تمنا لیے ہوئے ، آخر کہاں سے آیا؟ یہ کس کا فیضان نظر تھا ؟ اور اس سوال کے ساتھ ہی ذہن صدیوں کی اُلٹی زقند لگائے اور خیال اپنی غیر زمانی رفتار سے ماضی بعید کے وسیع و بسیط بیابانوں میں جا نکلتا ہے جہاں شور و مستی کے طوفانی چشمے اُبلتے اور سوز و گداز کے شیریں نغمے پھوٹتے ہیں۔ ذہن محدود سے نامحدود اور مجاز سے حقیقت کی وادیوں میں گھومنے لگتا ہے۔ اللہ اللہ جسم کہاں اور خیال کہاں ؟ ان دونوں کا یہ نہائت بُعد اور انتہائی اتصال بیک وقت ساتھ ساتھ چل رہے ہیں۔ بات کہیں سے کہیں جا پہنچتی ہے اور ایک ایسے مردِ کامل کی تصویر نگاہوں میں پھر جاتی ہے جو محبوب کی ہویت میں یوں گم کہ نام ہی "محبوب الٰہی" ہو کر رہ گیا۔

خواجہ نظام الدین اولیا محبوب الٰہیؒ وہ باکمال بوریا نشین جس کی بات بات میں علم و عرفان کی حلاوت تھی، جس کی ہر حرکت میں تعبد کی شان جلوہ گر جس کے ہر عمل میں عزیمت اور حسن کاری کا بانکپن ——— الغرض اس مردِ فقیر کی حیاتِ طیبہ، ایمان و ایقان، علم و عرفان، مجاہدات و مراقبات، واردات و مشاہدات، عشق و مستی، خلوص و وفا اور خدمت خلق کا ایسا حسین مُرقع تھی کہ

دل بے اختیار مائل ہوتا ، احترام و عقیدت کے جذبات خود بخود اُبھرتے اور ان کی عظمت کے نقوش گہرے سے گہرے ہوتے چلے جاتے۔

دُنیا بھر کے مورّخ ، مصنّف اور تذکرہ نویس متفق ہیں کہ امیر خسرو جیسے پُشتینی سپاہی اور درباری شاعر کو ادب شناس محبّت اور رمز آشنائے حقیقت بنا دینے والی یہی شخصیّت تھی۔ خسرو کو اسی جانِ خُوبی و محبُوبی نے نحوی سے محوی بنا دیا ، اسی نے خسرو کی زبانِ قال کو لسانِ حال میں بدل دیا۔ یہ اِسی کے تصرّف کا کرشمہ ہے کہ ایک شاہی ندیم ، تصوّف کے اہم اور معرکتہ الآرا مسائل کو اس صفائی ، روانی اور خلوص سے بیان کرتا ہے کہ معلوم ہوتا ہے اس راہ کا منزل شناس کہہ رہا ہے اور پھر وہ مقام بھی آیا کہ خسرو محبوبِ الٰہی کا سایہ بن کر رہ گیا ——

یہ بھی بجا کہ امیر خسرو کے کلام میں یہ سوز و گداز ، حسن و دلنوازی ، رنگینی و رعنائی ، جذب و شوق اور وارفتگی و بے خودی خواجہ محبوب الٰہی ہی کے فیض و برکت سے ہے۔ مگر کوئی تذکرہ نویس اس حقیقت سے بھی تو انکار نہیں کر سکا کہ دونو کی زندگی کے ابتدائی دَور میں بُعد المشرقین ہے۔ ایک "چمن زادی چمن پروردہ" خوشحال گھرانے میں آنکھ کھولی ، ناز و نعم کی آغوش میں پرورش پائی ، باپ کا سایہ سر سے اُٹھ گیا تو نانا عماد الملک کے سایۂ عاطفت میں چلے آئے جو امیر ابن امیر اور وزیر با تدبیر تھا۔ دوسرے کا بچپن تنگی و عُسرت کی اِک طویل داستان —— افلاس اور اُس پہ بچپن ہی میں یتیمی کے گہرے سائے ، انتہائی ناداری اور مسکنت۔ ماں بیٹے کی گذران کی کوئی سبیل ہی نہ تھی ، ایک کے رہنے کو حویلیاں اور محل ، دوسرے کے سر چھپانے کے لیے مسجدوں کے حجرے ، ایک کے ہاں نوکر چاکروں اور لگے بندھوں کی ریل پیل اور

دوسرے کی ماما بھی فاقوں سے تنگ آکر جواب دے گئی۔ ایک نے بچپن کے حسین مرغزاروں اور دوسرے نے تنگ و تاریک خارزاروں سے گذر کر شباب کی وادیوں میں قدم رکھا تو مشرق و مغرب کا وہی بُعد قائم رہا۔

دونو کے شباب کے دَور میں بھی زمین آسمان کا فرق ہے۔ ایک دربدری زندگی بسر کر کے عالمِ دین بنا جو بادشاہوں کے سایہ سے دور اور شاہی تقرب سے نفور تھا۔ اُس کا یہ عقیدہ کہ عالمِ دین بادشاہ کا جس قدر مقرب ہوتا جاتا ہے، اسی قدر حق تعالیٰ سے دُور ہوتا جاتا ہے۔ دُوسرا ایک خوش بیان شاہی مصاحب، ایک بذلہ سنج ندیم اور مدح گو درباری شاعر جس نے مدتوں مدح سرائی کی۔ ایک دو چار سے نہیں، یکے بعد دیگرے نصف درجن سے زائد بادشاہوں کے دربار سے تعلق رہا۔ اُدھر ایک شاہی حباب ٹوٹتا اِدھر یہ بھول جاتا۔ اس کے اُفق پر ہمیشہ کوئی نہ کوئی نیا ستارہ ابھرتا رہا اور یہ پینترا بدل کر شیریں نغمے الاپتا اُدھر کا رُخ کرتا۔ کہتے ہیں کہ کسی فانی انسان کے نصیب میں خالص مسرت نہیں۔ مگر امیر خسرو کی زندگی کا یہ زمانہ ایسا رہا کہ بقول پروفیسر حبیب عُمر خیام کو اس پر رشک آئے اور بے اختیار اَحْسَنْتَ پکار اُٹھے۔ امیر خسرو ان درباروں کی فیاضی میں خوب نہائے [1]

ہمیں چونکہ ان دونوں کے باہمی جذب و اتحاد اور حسین امتزاج پر قلم اُٹھانا مقصود ہے جہاں مشرق و مغرب کے یہ طویل فاصلے سمٹ کر ایک ہی مرکز پر مرکوز ہو کر رہ جاتے ہیں۔ جہاں ایک کا عشق، دوسرے کا ہادی، اُس کا رہبر، اُس کا محور، اور اُس کا محرک بن کر رہ جاتا ہے جہاں پھر اسے

---

[1] سوانح حیات امیر خسرو از پروفیسر محمد حبیب، چاپ ہندوستانی اکیڈیمی ۱۹۴۸ء صہ ۹

ایک لمحے کی جدائی بھی شاق گزرتی ہے اور مولانا عراقی سے ہمنوا ہو کر وہ پکار اُٹھتا ہے ؎

زفراق چون نالم زدل شکستہ چون نی
کہ بسوخت بند بندم زحرارت جُدائی
نہ بسر و تکیہ کردم نہ بسایۂ صنوبر
بتو تکیہ کردم ای شہ کہ تو سایۂ خُدائی

ظاہر ہے اس کٹھن کام کے لیے ہمیں دونوں کی سیرت کا مختصر مگر بھرپور جائزہ لینا ہوگا اور یہ امر بھی مسلّمہ ہے کہ شخصیت اور کردار کا مطالعہ کئی پہلوؤں سے کیا جا سکتا ہے اور اس کی تصویر کئی آئینوں میں دکھائی جا سکتی ہے لیکن جو اس کے طرزِ زندگی اور ارتقائے ذہنی و قلبی کا نفسیاتی مطالعہ نہیں کرے گا، وہ اسے نہیں سمجھ سکے گا، جوہرِ سیرت کا صحیح اندازہ لگانے کے لیے ضروری ہے کہ دونو کے خاندانی حالات کے علاوہ اُس ماحول، فضا اور سرزمین کا بھی مختصر جائزہ لیا جائے جن کے ہر چشمہ سے اس نخل برومند کی کونپلیں شاداب ہوئیں۔

اگرچہ دونو کا زمانہ ایک ہی ہے مگر مرشد کو چونکہ مُرید پر تھوڑا بہت تقدمِ زمانی حاصل ہے، ہم انہی کے حالاتِ طیبہ سے آغاز کرتے ہیں :-

اسمِ گرامی محمد ابنِ احمد۔ القاب سلطان المشائخ، سلطان الاولیاء، سلطان السلاطین، نظام الدین اولیاءؒ اور محبوب الٰہیؒ۔ ان کے جدامجد خواجہ سیّد علی جیّد عالمِ دین تھے۔ اربابِ صدق و صفا ہمیشہ وطن و دیار کی قید سے آزاد رہے ہیں۔ خدا کی ساری خدائی ان کا وطن اور ساری زمین اُن کا گھرانہ رہی کیونکہ ان کے علم و پیغامِ حق کی جنس تو وہ متاعِ عالم گیر ہے جس کے لیے ساری دُنیا

روز بازار کا حکم رکھتی ہے۔

رُشد وہدایت کا درس دینے کے لیے بخارا سے رختِ سفر باندھا اور منزلیں مارتے لاہور پہنچے۔ یہاں چند دن قیام کیا اور پھر آگے بڑھے اور تذکیر و ارشادِ حق کے لیے "بدایون" کی سرزمین کو منتخب کیا۔ یہیں ۱۲۳۸ء میں خواجہ محبوبِ الٰہی پیدا ہوئے۔

مطلق ایں آواز خود از شہ بود

ابھی آپ پانچ سال ہی کے تھے کہ ان کے والدِ ماجد خواجہ احمد مرض الموت میں مبتلا ہوئے۔ پروفیسر حبیب آف علی گڑھ سے منقول[1] ہے کہ ان کی پاک باز ماں بی بی زلیخا نے خواب میں دیکھا جیسے کوئی پوچھ رہا ہو کہ کس کو لوگی۔ شوہر کو یا بیٹے کو؟ —— ماں کی ممتا سے مجبور ہو کر بچے کی جان کو شوہر کی جان پر ترجیح کی، آخر قسمت کا لکھا پیش آیا۔ خواجہ احمد کچھ دنوں بعد انتقال کر گئے اور خواجہ کو یتیم چھوڑ گئے ؏

ابھی آ کے ہم نہ بیٹھے کہ وہ اُٹھ گئے جہاں سے

سیرتِ فرزندہا از اُمہات

پاک باز بیویوں کی ساری دُنیا لے دے کے شوہر کی ذات ہوتی ہے۔ وہ اُٹھ گئے تو گھر بھر میں ویرانیاں پھیل گئیں۔ تاریکی کے سائے اور بھی بڑھ گئے، یتیموں اور بیواؤں کے دن اور راتیں جتنی طوفانی ہوتی ہیں، اتنی ہی طولانی بھی۔ وہ غربت و افلاس کی ایک ایسی تاریک فضا میں رہ رہے تھے، جہاں تشنگی اور تحیّر کے سوا کچھ نہ تھا مگر بلند ہمت خاتون کا قدم نہ ڈگمگایا۔ خدا کی

---

[1] سوانح حیات امیر خسرو ص ۲۹ تالیف پروفیسر محمد حبیب، ہندوستانی اکیڈیمی ۱۹۴۸

قدرت اور رحمت کا پورا اندازہ ایک عورت کے دل کو دیکھ کر ہی ہو سکتا ہے۔ اس میں کس قدر امکاناتِ خوابیدہ ہوتے ہیں۔ کس قدر ذمہ داری کا بوجھ اُٹھانے کی قوّت ہوتی ہے۔

اُس پارسا اور فرشتہ خصلت خاتون کی زندگی میں بس اسی یتیم کے دم سے روشنی تھی۔ دُنیا کے اس اندھیرے میں فقط وہی اِک چراغ تھا، زمانہ کے خارستان میں اسی کی ننھّی سی ذات گلاب بن کر مہک رہی تھی۔ دہر کے خس و خاشاک اور کنکروں میں وہی اک گوہرِ شب چراغ تھا۔ وہ سائے کی طرح بچّے کے ساتھ چمٹی رہتی۔ نیکی، پارسائی اور شرافت کے اس زندہ پیکر کا اثر خواجہ محبوبِ الٰہیؒ نے بچپن ہی سے قبول کرنا شروع کیا۔ دنیا کے اس دھندلکا رمیں آپ کے لیے وہی روشنی کا مینار تھی۔ آپ کو ماں سے بے حد پیار تھا۔ آپ کے لیے اسی کی ذات سرچشمۂ الہام تھی۔ وہ جانِ دردمند علائق ظاہری سے نفور تھی۔ ماں کی خوبُو کا آپ پر گہرا اثر تھا۔

یہ زمانہ بڑی ہی تنگی اور عُسرت کا تھا۔ ماں اور بچّے اور ایک بہن کے گُزران کی کوئی سبیل نہ تھی سوائے اس کے کہ ہمسائے بے طلب کچھ اپنی مرضی سے دے دیتے۔ گھر کی ماما بھی فاقوں سے تنگ آکر جواب دے گئی۔ باوجود انتہائی ناداری کے ماں نے ان کی تعلیم سے قطعاً غفلت نہ برتی۔

ابتدائی تعلیم کے لیے	جو ہو پردوں میں پنہاں چشمِ بینا دیکھ لیتی ہے

بدایوں کے نامور عالم مولانا علاؤالدین کے سامنے زانوئے تلمّذ تہ کیا۔ اُن سے 'قدوری' ختم کی، خاندانی جذب و طہارت، پاک دل و پاکباز ماں کا فیضانِ نظر، اس پہ کامل اُستاد کی تعلیم و تربیت۔ یہ جوہرِ خوبی و محبوبی خوب چمکا۔ مروّجہ

علوم فارسی و عربی پر مکمل دسترس حاصل کر کے فقہ و حدیث کی طرف رجوع کیا۔ علومِ ظاہریہ کی ابتدائی تکمیل کے بعد دستارِ فضیلت حاصل کی۔ دردمندی، سوز و گداز اور عاشقانہ تڑپ انھوں نے بہت حد تک ورثہ میں پائی۔ آگے چل کر کاملین و واصلین اور کامل اساتذہ کی تربیت سے توکل، بے نیازی، رقت، بخود مشغولی، مسکنت اور دیگر صوفیانہ جذبات ابھرے۔

شاگرد کی ذہنی بیداری، طبعی جوہر کی ندرت اور غیر معمولی درخشندگی کو دیکھ کر اُستاد نے ننھے شاگرد کے مستقبل کو بھانپ لیا تھا۔ آپ کو دستارِ فضیلت باندھتے وقت اُستاد نے دیگر علما و مشائخ کو بھی مدعو کیا اور پیشگوئی کی کہ اس لڑکے کا سر کسی انسان کے آگے نہیں جھکے گا۔ اُستاد کی یہ پیشگوئی حرف بہ حرف پوری ہوئی۔ بڑے ہو کر اس بوریا نشین سلطان نے دُنیاوی حرص و طمع سے دُور رہ کر بڑی سے بڑی طاغوتی طاقت کو خاطر میں لائے بغیر دین کی خاطر بڑے سے بڑا خطرہ مول لیا اور جابر حکمرانوں کے سامنے کلمۂ حق کہنے کی جرأت و جسارت کی اور عوام پر اُٹھنے والے جابر ہاتھوں کے سامنے سپر بنے رہے۔ اپنے خدا کے سامنے جھک کر بڑے بڑے سلاطین کا سر جھکا دیا۔

ابھی تک شیخ کی تعلیم درسِ رائج کی نہج پر ہوئی تھی مگر ان کا رجحانِ طبع تصوف کی طرف تھا۔ وہ کم سنی میں اکثر اپنے ساتھیوں سے کہا کرتے تھے کہ میں تم لوگوں کی علمی مباحث کی فضا میں زیادہ عرصے تک نہیں رہ سکتا۔۔۔ بدایوں ایک مختصر اور محدود جگہ تھی۔ علم و فضل کا اصل مرکز اور عالموں، فاضلوں کا گہوارہ مرکزی شہر اور عروس البلاد دہلی تھا۔ ظاہری علوم کے ساتھ باطنی علوم کی کشش ماں بیٹے کو کشاں کشاں دہلی لے آئی۔ مسجد کے ایک حجرے میں قیام فرمایا اور تعلیمی سرگرمیوں میں جُت گئے۔

اس مرکزی شہر میں تعلیم مفت تھی۔ ہونہار، ذہین، ذکی، محنتی اور شریف النفس شاگردِ رشید نے چند ہی مہینوں میں بڑے بڑے مدرّسوں تک رسائی حاصل کر لی۔ پہلے مولانا شمس الدین دامغانی کے درس میں بیٹھے۔ اُس استادِ کامل کو بلبن کے دربار سے شمس الملک کا خطاب تھا۔ اُن کا دستور تھا ہونہار عزیز شاگردوں کو اپنے حجرۂ خاص میں بُلا کر درس دیتے۔ ان تین خوش قسمت شاگردوں میں سے ایک ہمارے شیخ بھی تھے۔ ان میں سے کوئی غیر حاضر ہوتا تو ازروئے تفنن کہتے میاں، میں نے تمھاری کیا خطا کی جو تم درس میں شریک نہ ہوئے بتا دو تاکہ پھر وہی خطا کروں اور تم غائب رہو۔ شیخ اگر اتفاق سے کسی دن درس میں حاضر نہ ہوتے تو جب اُستاد کے پاس جاتے وہ محبوب کو دیکھ کر یہ شعر پڑھا کرتے ؎

باری کم از آنکہ گاہ گاہی
آئی و بما کنی نگاہی

انھی سے حریری کے چالیس مقامات بھی پڑھے اور ساتھ ساتھ قرآنِ پاک بھی حفظ کیا۔

دلِ پادشاہاں لرزد ز گدائے بے نیازے

ادھر سے فارغ التحصیل ہوئے تو مولانا کمال الدین زاہد کے سامنے زانوئے ادب تہ کیا، اُن سے حدیث اور مشارق الانوار کا درس لیا۔ مولانا کمال الدین بڑے جیّد عالم، متّقی اور متدیّن بزرگ تھے۔ وہ اپنی آزاد منشی کے لیے شہرۂ آفاق تھے۔ سُلطان غیاث الدّین بلبن نے جب ان کی پارسائی کا حال سُنا تو دربار میں بُلایا اور امامِ اعلیٰ کا عہدہ پیش کیا۔ مولانا نے بڑی بے نیازی سے جواب دیا کہ :

لے دے کے ہمارے پاس ہماری نماز ہی رہ جاتی ہے، کیا سلطان چاہتا ہے کہ اس کو بھی ہم سے چھین لے۔ یہ برجستہ جواب سُن کر سُلطان بالکل لاجواب ہوگیا۔ ایسے آزاد مشرب، حق پرست اور بے نیاز اُستاد سے شیخ نظام الدین اولیا نے بیس سال کے سِن میں سندِ تکمیل لی۔ صاحبان جاہ و ثروت کی طرف سے وہ بے توجہی اور بے نیازی جو شیخ کی زندگی کی امتیازی خصوصیت رہی، انہی کا فیضانِ صُحبت تھا۔

تذکرۂ اولیائے کرام میں مذکور ہے کہ جن دنوں آپ مسجد کے نیچے ایک حجرے میں رہائش پذیر تھے۔ بابا فرید گنج شکر کے چھوٹے بھائی شیخ نجیب الدین متوکل کا مکان ان کے ہمسائے میں تھا۔ یہ صاحبِ حال بزرگ بھی ظاہری اور باطنی علوم سے آراستہ تھے، آپ ان کے ہاں اکثر آتے جاتے۔ ان سے بابا فرید گنج شکر کے کمالاتِ معنوی کی داستانیں سُن کر شوقِ زیارت نے انگڑائی لی ایک دفعہ ابوبکر نامی ایک قوال ان کے ہاں مہمان ہوا۔ اس نے بابا فرید گنج شکر کی خانقاہ اور ان کے رُوحانی فیوض و برکات کا نقشہ کچھ ایسے الفاظ میں کھینچا جو ان کے خفتہ جذباتِ درد کے لیے بانگِ سحر کا کام کر گیا۔ انھوں نے اجودھن (موجودہ پاک پتن) جاکر زیارت کرنے کا عزم کر لیا۔ پڑھائی کے دنوں تک تو یہ چنگاری دبی رہی۔ جُونہی سندِ تکمیل لی، یہ چنگاری سُلگ اُٹھی۔ دن رات، سوتے جاگتے، اُٹھتے بیٹھتے یہی ایک خیال دامنگیر تھا۔ اب بظاہر کوئی چیز مانع نہ تھی۔ صرف اشارۂ غیبی کا انتظار تھا۔ تذکرہ نویس لکھتے ہیں کہ ایک رات شہر کی جامع مسجد میں مقیم تھے کہ رات کے پچھلے پہر موذن نے مینار پر چڑھ کر یہ آیت پڑھی: اَلَمْ یَاْنِ لِلَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اَنْ تَخْشَعَ قُلُوْبُھُمْ لِذِکْرِ اللّٰہِ ط

(کیا وہ وقت نہیں آیا کہ جو لوگ ایمان لائے ہیں، ان کے دل

اللہ کے ذکر اور اس کی فضیلت سے جھک جائیں)

رات کا پچھلا پہر اور یہ معنی خیز اشارۂ غیبی۔ دل پر سرور کی ایک عجب کیفیت طاری ہوگئی۔ آتشِ شوق بھڑک اُٹھی۔ رخت سفر باندھا اور اجودھن کا رُخ کیا، منزلیں مارتے ہوئے آخر منزلِ شوق پہ جا پہنچے اور سیدھے بابا فریدؒ کی خانقاہ پہ حاضر ہوئے۔ یہ دُنیا عجیب دُنیا تھی۔ ایک سکوت کامل، ہمہ گیر سناٹا، ـــــ سکوت اور سناٹے کی دُنیا، عقیدت مندوں کا مرکز، عوام و خواص کی ادب گاہ ـــــ خاک نشینوں کا عرش، جہاں انسان تصوف کے کردار میں ڈھلتے اور رُوحانیت کے سُچے موتی رولتے تھے۔ طہارت و پاکیزگی کے جام لنڈھائے جاتے تھے۔ ذکر و اذکار کے شیریں نغمے پھُوٹتے تھے۔ اس خاکی فضا میں رُوح کو بالیدگی ملتی تھی ؎

"ایزدی بود آشنائی ہائے ما آشنا داند صدائے آشنا"

بابا فریدؒ کے حضور میں پہنچے۔ مردِ حق کے روحانی جلال کو دیکھ کر اتنا مرعوب ہو گئے کہ زبان سے کچھ بھی نہ نکل سکا، ادب کا یہ سکوت بھی ایسا سکوت تھا جس پہ سینکڑوں تقریریں فدا۔ بابا فریدؒ نے ایک ہی نگاہ میں بھانپ لیا اور آنے والے نوجوان کی رُوح کو ازل ہی سے آشنا پایا۔ دیکھتے ہی بابا صاحبؒ نے یہ شعر پڑھا ؎

اے آتشِ فراقت دلہا کباب کردہ

سیلابِ اشتیاقت جانہا خراب کردہ

پھر ڈھارس بندھاتے ہوئے فرمایا کہ "جو پہلی بار آتا ہے، اتنا ہی خوف زدہ ہو جاتا ہے"۔ بابا فریدؒ نے خود ان کا سر مُونڈا۔ ان سے بیعت لی۔ اپنی چہار ترکی ٹوپی سر سے اُتار کر مرید کے سر پر رکھ دی[1] جسے آپ نے

---

[1] سیر الاولیاء ص ۱۰۶

عمر بھر تاجِ شاہی سمجھا۔

بابا فریدؒ سے آپ نے "عوارف المعارف" اور "تمہید ابو شکور سالمی" پڑھی۔ ظاہری علوم میں بھی بابا کے علمی تبحر سے استفادہ کیا، چنانچہ خواجہؒ کا شمار متبحر علما میں ہونے لگا۔

خوشتر آن درسی کہ گیری از نظر

خواجہ نے خدا سے طبعِ رسا اور قلبِ سلیم پایا تھا۔

حقائق معرفت اور رموز تصوف سیکھنے کا وقت آیا تو اس پاک دل، پاک باز اور پاک بین مرید نے مہینوں کے فاصلے دنوں میں طے کیے، ۱۵ رجب ۵۵۵ھ سے ۳ ربیع الاوّل ۵۶۶ھ تک مرشد کامل کے زیرِ تربیت رہے۔

یہ عرصہ بڑی عسرت، تنگی اور فاقہ مستی کا تھا۔ آپ نے اسے بڑے صدق و اخلاص اور پامردی سے بسر کیا، تذکرہ نویس لکھتے ہیں کہ ان دنوں آپ کے پلّے کبھی پیسہ تک نہ ہوتا تھا کہ صابون ہی خرید سکیں۔ جب ان کے کپڑے اتنے میلے ہو جاتے کہ پہننے کے قابل نہ رہتے تو ایک نیک دل بی بی دھو دیا کرتی تھیں۔[1] بزمِ صوفیا کے فاضل مولف کا بیان ہے کہ وہاں کھانے کا انتظام خاص مریدوں کے سپرد تھا۔ مولانا بدرالدین اسحٰق لنگر خانے کے لیے ایندھن کی لکڑیاں چُن کاٹ کر لاتے۔ شیخ جمال الدین ہانسوی جنگل جا کر ویلہ لایا کرتے۔ یہ ایک قسم کا پھل تھا جس کا نمک اور سرکہ ملا کر اچار بناتے۔ حسام الدین کابلی پانی بھر کر لاتے اور باورچی خانے کے برتن دھویا کرتے۔ خواجہ نظام الدین اولیا دیگوں کو پکانے کی خدمت انجام دیتے۔ کبھی

---

[1] بزمِ صوفیا مرتبہ سید صباح الدین عبدالرحمٰن۔ ص ۱۸۳، ۱۸۴۔ اعظم گڑھ ۱۹۴۹ء

نمک ملتا، کبھی نہ ملتا۔ اتفاق سے ایک دن نمک نہ تھا۔ آپ نے نزدیکی بقال سے قرض لے کر کھانے میں ڈال دیا۔ کھانے کے لیے بیٹھے۔ بابا فریدؒ نے نوالہ اٹھایا تو فرمایا "ازین بوئ اسراف می آید" خواجہ محبوب الٰہی نے عرض کیا کہ اس کھانے میں نمک قرض کا ہے۔ بابا نے کھانے سے ہاتھ کھینچ لیا اور فرمایا، مقروض درویش کو اچانک موت آجائے تو قیامت میں اس کی گردن قرض کے بوجھ سے جھکی رہے گی۔ قرض اور توکل میں بُعد المشرقین ہے۔ درویشوں کو فاقہ سے اگر موت آجائے تو اس سے بہتر ہے کہ لذت نفسانی کے لیے وہ مقروض ہوں۔ کھانا غریبوں، مسکینوں اور محتاجوں میں تقسیم کر دیا گیا۔ خواجہ نظام الدین اولیاؒ کا بیان ہے کہ ہیبت کے مارے مجھ پہ کپکپی طاری ہو گئی۔ اُسی وقت قرض لینے سے توبہ و استغفار کی، وہ تو تھی اہلِ دل کی دُنیا۔ مُرشد کو میری اس توبہ کا کشف ہوا۔ جس کملی پر بیٹھے تھے، وہی کملی مجھے عطا کر کے ارشاد فرمایا "خدا نے چاہا تو آئندہ تمھیں قرض کی ضرورت نہ پڑے گی"

ع آہ نہ بھر لبوں کو سی عشق ہے دِل لگی نہیں

شیخ طالب علمی کے زمانے میں اپنی فطری ذہانت کی وجہ سے مشہور تھے۔ ان کے دوستوں اور ساتھیوں کا خیال تھا کہ وہ تکمیلِ علم کے بعد کسی اعلیٰ عہدے پہ فائز ہوں گے مگر اُن کی تو راہ ہی مختلف تھی، بابا فریدؒ کے ہاتھ پہ بیعت کر کے مئی فقر و فاقہ کو دوآتشہ بنالیا۔ تذکرہ نویس لکھتے ہیں کہ ایک دن اجودھن میں پھٹے پُرانے کپڑے پہنے پھر رہے تھے۔ اتفاقاً ایک پُرانے ہمدرس اور ساتھی سے ملاقات ہو گئی۔ اُس نے اپنے لائق اور ذہین ہم جماعت کو اس حال میں دیکھا تو سخت متعجب ہو کر کہا یہ کیا حال ہے۔ اگر تم شہر میں لوگوں کو تعلیم دیتے تو مجتہدِ زمانہ

کہلاتے اور لوگ جوق در جوق تمھارے درس میں حاضر ہوتے۔ یہ سُن کر آپ خاموش رہے۔ لوٹ کر جب مُرشدِ کامل کی خدمت میں پہنچے تو انھیں کشف سے ان کی ذہنی حالت کا پتہ چل چکا تھا۔ فرمایا چُپ کیوں رہے۔ باورچی خانہ سے کھانے کا ایک خوان لو اور سر پر رکھ کر اپنے دوست کے پاس لے جاؤ اور اس کی بات کا یہ جواب دو ؎

نہ ہمرہی تو مرا راہِ خویش گیر و برو
ترا سعادت بادہ مرا نگون سازی

دُنیا کی طرف سے جو ذرا سی رغبت ہو سکتی تھی، پیرِ کامل کی اِس نفسیاتی تدبیر سے وہ بھی محو ہو گئی۔ شیخ کامل نے محسوس کر لیا تھا کہ اُن کی اور اُن کے دوست کی راہیں مختلف ہیں۔ عشق و محبت کی دنیا کے آئین و آداب نرالے ہوتے ہیں۔

"باز ہم آنجا رویم باز کہ آن شہر ماست"

باطنی علوم سے مالا مال ہو کر اب واپس لوٹنے کی ٹھانی۔ رُخصت ہونے کا ارادہ کیا تو بابا فریدؒ نے بطور زادِ راہ ایک اشرفی دی جو لے دے کے اُن کے گھر کی کُل دولت تھی۔ رات کو جب مُرید باصفا کو معلوم ہوا کہ آج میرے پیر کے گھر میں فاقہ ہے تو وہی اشرفی لا کر بکمال عقیدت و ارادت باباؒ کے قدموں میں ڈال دی۔ بابا فریدؒ اس لطیف اِشارے سے بہت متاثر ہوئے۔ شکریے کے ساتھ قبول کر لی۔ فرمایا میں نے دُعا کی ہے کہ خُدا تم کو

دُنیاوی جاہ وحشم سے بھی تھوڑا بہت عطا فرمائے۔ پھر ان پر نظرِ توجہ کی۔ جب چہرے پر پریشانی کے کچھ آثار دیکھے تو فرمایا پریشان نہ ہو۔ دنیا تمھارے لیے فتنہ نہ ہوگی۔ دراصل پیر روشن ضمیر کو معلوم ہوگیا تھا کہ اس کا جانشین کس رُتبے کو پہنچنے والا ہے اور درحقیقت یہ اسی مردِ کامل کا فیضانِ نظر تھا ؎

اوّل اندر نارِ خود سوزد ترا
باز سُلطانی بیا موزد ترا

بڑی مسرّت سے رُخصت ہونے کی اجازت دیتے ہوئے فرمایا:
"میں نے تم کو ہندوستان کی روحانی سلطنت دے دی۔ جاؤ اور اُس پر قبضہ کرلو۔" چلتے وقت دو باتوں کی نصیحت کی: قرض سے احتراز کرنا۔ اگر کسی سے لینا پڑ ہی جائے تو جلد ادا کرنے کی کوشش کرنا۔ دوسرے اپنے دُشمنوں کو ہر حال میں خوش رکھنے کی سعی کرنا۔

مریدِ باصفا نے عمر بھر ان نصیحتوں کو حرزِ جان بنائے رکھا۔ بزمِ صوفیا کے فاضل مؤلف[1] لکھتے ہیں کہ جب دہلی واپس آئے تو ایک عزیز کے پاس پہنچے جس سے اُنھوں نے ایک کتاب مستعار لی تھی اور وہ گُم ہوچکی تھی۔ اُن سے فرمایا کہ میری نیّت صادق ہے۔ کاغذ مہیّا کرکے انشاء اللہ آپ کی کتاب لکھ کر آپ کے حوالے کردوں گا۔ وہ عزیز ان کی اس بات سے اس قدر متاثر ہوئے کہ وہ کتاب انھیں بخش دی۔ پھر ایک بزاز کے پاس گئے جس سے کبھی ۲۰ ٹنکے کا کپڑا اُدھار لے کر دس ٹنکے ادا کردیے ہُوئے تھے اور باقی دس ہنوز واجب الادا تھے۔ اُن سے بھی جلد قرض چُکانے کا وعدہ کچھ ایسے

---

[1] بزمِ صُوفیا مرتبہ صباح الدین عبدالرحمٰن ص۔ چاپ۔ اعظم گڈھ ۱۹۴۹ء

الفاظ میں کیا کہ وہ بھی اُس نے بخش دیے۔

اپنی ہر مُشکل کے لیے مُرشد کامل کی طرف رجُوع کرتے۔ ہر اُلجھن کے حل کیلئے پاک پتن ہی کا رُخ کرتے۔ کتنی مرتبہ طویل سفر طے کر کے آستانۂ مُرشد پہ حاضری دی اور اب وہ اپنے مُرشد کے دل کی گہرائیوں میں اس طرح بستے تھے، جیسے دریا کی گہرائیوں میں چودھویں کا چاند۔ حتیٰ کہ بابا فریدؒ نے اعلانیہ فرمادیا کہ "علمِ سینۂ من بہ نظام الدین اولیا بدایونی رسید" آخری بار جب زیارت کو گئے تو بابا فرید گنج شکرؒ نے دُعا دی "خدا تجھے نیک بخت بنائے۔ تم ایسے درخت ہو گے جس کے سایہ میں مخلوق آرام پائے گی اور نصیحت کی کہ حصول استعداد کے لیے برابر مجاہدہ کرتے رہنا۔

نظام الدین اولیا محبوب الٰہی اجودھن سے لوٹ کر اپنے نئے مسکن کے لیے متذبذب تھے کہ دار السلطنت میں رہوں یا کہیں اور گوشۂ عافیت ڈھونڈوں۔ تھوڑے ردو قدح کے بعد دلّی ہی پہ نگاہِ انتخاب پڑی اور وہیں مردانہ وار فرائض کو انجام دینے کا تہیہ کر لیا۔

ہر کجا شمعِ بلا افروختند
صد ہزاراں جانِ عاشق سوختند

اس نئی زندگی کے ابتدائی سال پھر بے حد تنگی اور عُسرت کے تھے۔ غیاث پُور میں مستقل سکونت اختیار کرنے سے پہلے ایک محلّے سے دوسرے محلّے میں منتقل ہوتے رہے۔ بسر اوقات کا بھی کوئی خاص ذریعہ نہ تھا، دستِ سوال دراز کرنا اُن کا شیوہ نہ تھا۔ یہیں توکّل و استغنا کی بڑی کٹھن اور صبر آزما منزلوں سے گزرے۔ بعد کو جب یہ بادل چھٹ گئے تو شیخ کہا کرتے تھے کہ غیاث الدین

بلبن کے زمانے میں خربوزہ ایک جیتال[1] میں ملتا تھا لیکن پوری فصل گزر گئی اور میں ایک قاش بھی نہ چکھ سکا۔ ایک بار ایک دن اور ایک رات بے آب و دانہ گزر گئے۔ دوسری رات بھی آدھی گزر گئی جب کچھ کھانے کو ملا۔ کبھی فرماتے کہ ایک جیتال میں دو سیر روٹیاں ملتی تھیں لیکن میرے پاس پھوٹی کوڑی بھی نہ ہوتی تھی۔ میں بازار سے کچھ نہیں خرید سکتا تھا میری ماں بہن اور دیگر اہلِ خانہ اس فاقہ مستی اور تنگ دستی میں میرے شریکِ حال تھے۔ ایک بار ہم لوگوں پر تین دن کڑاکے کے فاقے گزر گئے۔ تب کسی شخص نے دروازے پر دستک دی اور برتن میں کچھ کھچڑی دے گیا۔ مجھے زندگی بھر کسی چیز میں وہ مزہ نہ آیا جو اس وقت اس سادی کھچڑی میں آیا تھا۔

جب گھر میں کھانے کو کچھ نہ ہوتا تو میری ماں کہا کرتی تھیں: گھر میں نام خُدا، بچّو! آج ہم لوگ خدا کے مہمان ہیں۔ ان الفاظ کو سُن کر ایک ناقابلِ بیان مسرّت میرے دل میں موجزن ہو جاتی تھی۔ ایک بار میں نے خواب میں دیکھا کہ شیخ نجیب الدین متوکّل برادرِ شیخ فریدؒ میرے مکان پر آئے۔ میں نے ماں سے پوچھا: کھانے کی کوئی چیز گھر میں موجود ہے۔ فرمایا: بیٹا، گھر میں کھانے کو کچھ نہیں۔ اُس کے بعد ہی میں نے خواب میں دیکھا کہ حضورؐ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم مع صحابۂ کرامؓ کے ہمارے ہاں آرہے ہیں۔ میں نے آگے بڑھ کے قدم مُبارک چُومے اور عرض کیا غریب خانے پر تشریف لے چلیے۔ فرمایا، کاہے کو؟ میں نے عرض کیا جو رُوکھا سُوکھا میسّر ہوگا، حضورؐ اور صحابہؓ کی خدمت میں حاضر کر دوں گا۔ حضورِ پُر نور نے فرمایا ابھی تو تمھاری والدہ نے تمھیں بتایا کہ گھر پر کھانے کو کچھ نہیں۔ میں بہت نادم ہوا۔

---

[1] ۲۵ جیتل : ۱ درم اور ۴۰ درم : ۱ روپیہ

اسی عسرت کے زمانے میں دو دن کے فاقے کے بعد شیخ روٹی کے سوکھے ٹکڑے کھانے بیٹھے تھے کہ کسی فقیر کا ادھر سے گزر ہوا۔ اس نے خیال کیا کہ شیخ کھانا ختم کر چکے ہیں۔ وہ دسترخوان سے ٹکڑے اُٹھا کر چلنا بنا۔ خندہ پیشانی سے مُسکرا دیے اور فرمایا ہماری مصیبتیں ہمارے خدا کو بھا گئی ہیں اس لیے وہ اور اِمتحان کرنا چاہتا ہے۔ بعض مُریدوں نے ان کی فاقہ مستیوں اور تنگ دستیوں کو دیکھ کر دولت پیدا کرنے کے چند ذریعے بتائے، مگر انھیں غیر اسلامی اور غیر شرعی کہہ کر رد کر دیا۔ ہمیشہ یہی کہتے رہے کہ آدمی اگر کسی مقام سے گرے بھی تو چاہیے کہ شرع ہی میں گرے۔

زندگی کے یہ کٹھن دن بڑے سکون قلب سے گزر رہے تھے۔ برگزیدہ ماں نے بھی ان تمام مصائب کو اپنے بیٹے کے ہمراہ بڑی خندہ پیشانی سے برداشت کیا۔ دونو کے توکّل کا یہ حال تھا کہ کوئی دنیاوی مصیبت ان کی روحانی طمانیت کو متزلزل نہیں کر سکتی تھی۔ ماں کی زندگی کا آخری پہرہ تھا، مسلسل فاقوں نے صحت پر ناگوار اثر کیا۔ وہ مرض الموت میں مبتلا ہوئیں۔ شیخ نے نیا چاند دیکھ کر اپنا سر ان کے قدموں پر رکھا تو انھوں نے پُوچھا آیندہ مہینے تم کس کے قدم چُومو گے نظام؟ بیٹے نے کہا اماں، تم مجھے کس کے سپرد کرو گی؟ صُبحدم ماں نے انھیں بستر کے نزدیک بُلایا ہاتھ پکڑ کر کہا "اللہ، میں اپنے بیٹے کو تیرے سپُرد کرتی ہوں ——" یہ الفاظ ان کی زبان پر تھے اور ان کی رُوح اعلیٰ علیین میں رفیق اعلیٰ کے پاس جا پہنچی۔

چونکہ بی رنگی اسیرِ رنگ شد
مُوسیٔ با مُوسیٔ در جنگ شد

مسلمانوں کے لیے یہ دَور بڑا ہی پُر آشوب دَور تھا۔ جن دنوں آپ علومِ ظاہری و باطنی کی منزلیں طے کر رہے تھے؛ وسطِ ایشیا میں تاتاریوں کے ہولناک سائے بڑھتے جا رہے تھے۔ اسلامی ریاستیں مرکز سے کٹ کر پارہ پارہ ہوتی جا رہی تھیں۔ ہر کوئی ڈیڑھ اینٹ کی الگ مسجد بنا رہا تھا اور یہ اسلامی ریاستیں ایک دوسرے کی سیاسی حریف بن کر ایک دوسرے کا گلا گھونٹنے میں مصروف تھیں۔

اسلامی تہذیب و تمدّن اور ثقافت کے مراکز ویران و سُنسان ہوتے جا رہے تھے۔ ہر سُو اندھیرا ہی اندھیرا چھایا جا رہا تھا۔ بڑا ہی آشوبی اور انقلابی دَور تھا۔ زوالِ مملکت اور سقوطِ خلافت کے آخری مراحل طے ہو رہے تھے۔ اس انتشار اور افراتفری میں ہزاروں دولت مند گردشِ زمانہ کا شکار ہو کر نانِ شبینہ کو محتاج ہو گئے۔ سینکڑوں آبرو والوں نے اپنی جانیں اس ہنگامۂ گیر و دار کی نذر کر دیں۔ بہت سے شریف ہمیشہ کیلیے عزلت گزیں

ہو گئے۔

ادھر برِ صغیر میں امن و سکون کا ماحول تھا۔ اسلامی سلطنت اُبھر رہی تھی۔ اُدھر کے مصیبت زدہ اور مفلوک الحال خاندانوں کے لیے برِ صغیر دارالسلام سے کم نہ تھا۔ بہت سے خانماں برباد اور مفلوک الحال لوگوں میں جن کو چنگیزی حملوں نے وسط ایشیا سے بھگا کر برصغیر میں پناہ لینے پر مجبور کر دیا تھا، ایک ترک قبیلہ لاچین بھی تھا۔ اس قبیلے کا وطن صوبہ ماورالنہر تھا، امیر سیف الدین اس کے سردار تھے۔ یہ لوگ ہجرت کر کے دہلی کے نزدیک پٹیالی میں آباد ہو گئے۔ اسے مومن آباد یا مومن پورہ بھی کہتے ہیں۔ یہ مقام موجودہ صوبہ اتر پردیش کے ضلع ایٹہ میں گنگا کے کنارے واقع تھا۔

امیر سیف الدین نے جو صاحب شمشیر تھے، التمش کی ملازمت اختیار کر لی اور اس کی جنگی مہموں میں بڑھ چڑھ کر حصّہ لیا۔ خود اپنے قبیلے کے آدمیوں سمیت سپاہیانہ جوہر دکھائے۔ ملکی استحکام میں اہم کردار ادا کیا اور بادشاہ کی نظروں میں آ گئے۔ تذکرہ نویس متفق ہیں کہ انھیں بارہ ہزار طلائی ٹنکہ سالانہ وظیفہ ملتا تھا، جو اس امر کا کھُلا ثبوت ہے کہ انھوں نے اِدھر آکر اہم حیثیت حاصل کر کے کھویا ہوا وقار بحال کر لیا تھا۔

ادھر ہی عماد الملک راوت کی بیٹی سے شادی ہوئی۔ عماد الملک راوت ایک متموّل ہندو خاندان کا چشم و چراغ تھا۔ مشرف بہ اسلام ہو کر شاہی زمرے میں شامل ہوا اور بُلند مراتب پر پہنچا۔ بلبن کے عہد میں اسے قلمدانِ وزارت بھی سونپا گیا۔

"نعرہ زد عشق کہ خونیں جگرے پیدا شد"

پٹیالی کے مقام پر اسی متموّل اور آسودہ حال گھرانے میں امیر خسرو ۶۵۱ھ میں پیدا ہوئے۔ آپ کا نام ابُوالحسن اور لقب یمین الدین تھا — آپ اپنے ماں باپ کی منجھلی اولاد تھے۔ شعر و شاعری کا فطری ملکہ تھا۔ چھوٹی عمر میں مشقِ سخن شروع کر دی۔ تاریخی شواہد موجود ہیں۔ سب تذکرہ نویس متفق ہیں اور سب سے بڑھ کر تحفۃ الصغر میں ان کا اپنا بیان[1] کہ "در آن سن کہ دندان می افتاد سخن می گفتم" یعنی میرے دُودھ کے دانت ٹوٹ رہے تھے، اشعار پھر بھی مُنہ سے موتیوں کی طرح جھڑتے تھے۔

ع کہ پایا میں نے استغنا میں معراج مسلمانی

اُدھر شیخ کی شہرت دُور و نزدیک پھیل رہی تھی۔ جو ملتا، مسخر ہو جاتا۔ ۱۲۶۷ء میں شیخ فرید گنج شکرؒ اللہ کو پیارے ہوئے اور خواجہ کو اپنا خلیفہ بنا گئے۔ خواجہ نظام الدین اس وقت دہلی میں تھے مگر وصال سے کچھ دن پہلے بابا فریدؒ نے اپنا جانماز، عصا اور

---

[1] دیباچۂ تحفۃ الصغر

خرقہ جو اپنے مرشد حضرت خواجہ بختیار کاکیؒ سے پایا تھا، مولانا بدرالدین اسحٰقؒ کی معرفت دہلی بھجوا دیا۔

اب غریبوں کے ساتھ امیروں نے بھی آپ کی خانقاہ کا رُخ کرنا شروع کیا۔ امیروں نے گذر اوقات کے لیے پیشکشیں کیں مگر فقر کی شانِ بے نیازی نے انھیں درخورِ اعتنا نہ سمجھا۔ سلطان جلال الدین نے خانقاہی اخراجات کے لیے گاؤں نذر کرنا چاہا مگر آپ نے اسے درویشی کے مسلک کے خلاف سمجھ کر قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ آہستہ آہستہ خانقاہ مرجعِ خلائق بنی جا رہی تھی۔ امیر سیف الدین محمود اور عماد الملک کے خاندان بھی ان کے دستِ حق پرست پر بیعت کی سعادت حاصل کر چکے تھے۔

بیعت اوّل

مولانا شبلی لکھتے ہیں کہ امیر خسرو کی طبیعت میں عشق و محبت کا مادہ ازلی تھا۔ وہ سرتاپا عشق تھے اور یہ بجلی ان کے رگ و پے میں کوندتی تھی۔ قدسی نظامی صاحب تذکرہ امیر خسرو اور تذکرہ ہندو پاک کے فاضل مؤلف رقمطراز ہیں[1] کہ والد بزرگوار نے جب ان کی طبیعت صوفیا کی طرف متوجہ دیکھی تو ایک روز اپنے ہمراہ حضرت سلطان المشائخ کے آستانہ پر لائے۔ جب اندر جانے لگے تو امیر خسرو نے پوچھا: آپ مجھے کہاں لیے جاتے ہیں۔ فرمایا: میں تمھیں حضرت محبوب الٰہی کا مُرید کرانے کو لایا ہوں۔ والد ماجد سے دست بستہ عرض کیا کہ پیر کا پسند کرنا میرا فعل ہے نہ کہ آپ کا! والد ان کو دروازے ہی پر چھوڑ گئے۔

---

[1] تذکرہ الاولیا ہندو پاک ص: ۱۲۱

آپ نے وہیں بیٹھے بیٹھے ایک رباعی موزوں کی اور دل میں خیال کیا کہ اگر پیر روشن ضمیر ہیں تو اس کا کوئی جواب دیں گے۔ اگر جواب حسبِ حال آیا تو مُرید ہو جاؤں گا، ورنہ واپس۔ رباعی یہ تھی ؎

تو آن شاہی کہ بر ایوان حضرت　　کبوتر گر نشیند باز گردد
غریبی، مستمندی بر در آمد　　بیاید اندرون یا باز گردد

کشف سے خواجہ صاحب کو بھی معلوم ہو گیا۔ خادم کو بُلایا اور فرمایا کہ ایک ترک لڑکا دروازے پر بیٹھا ہے، تم یہ رباعی اس کے پاس جا کر پڑھ دو ؎

بیاید اندرون مرد حقیقت　　کہ با مایک نفس ہمراز گردد
اگر ابلہ بود آن مرد نادان　　از آن راہی کہ آمد باز گردد

یہ رباعی سُنی، دم بخود رہ گئے۔ اندر گئے اور حلقہ بگوشِ شیخ ہو گئے، شاعری کی طرف رغبت دیکھ کر شیخ نے حوصلہ افزائی بھی کی، یہ بیعت، بیعتِ اُول کے نام سے مشہور ہے۔

سیف از سرم برفت و دل من دو نیم ماند

امیر خسرو نے اپنی زندگی کی آٹھ بہاریں ہی دیکھی تھیں کہ ان کے والد سیف الدین محمود نے اس جہانِ فانی سے رختِ سفر باندھا۔ امیر خسرو لکھتے ہیں "از بسکہ شہادت در مذاقِ او شیریں بود؛ جانِ شیریں ہم بر سرِ آن شربت کرد" جس سے صاف پتا چلتا ہے کہ انھوں نے میدانِ جنگ میں شہادت پائی۔ آپ نے باپ کی وفات پر ایک مرثیہ لکھا جس کا مطلع یہ ہے ؎

سیف از سرم برفت و دل من دو نیم ماند
دریائے من رواں شُد و دُرِّ یتیم ماند

والد کی وفات کے بعد آپ اپنے نانا عماد الملک کی سرپرستی میں آ گئے۔ نانا کا دل نواسے کے لیے مہر و محبت سے پُر تھا۔ بڑے احسن طریق سے پرورش کی یتیم ہو کر بھی وہ زندگی کی تلخیوں سے قطعاً نا آشنا رہے۔

تعلیم و تربیت اور سخن گوئی کی ابتدا

خسرو شیریں بیان کے فاضل مولف لکھتے ہیں[1] کہ حصول علم کے لیے زانوئے ادب کس کے سامنے تہ کیا اور باقاعدہ تعلیم و تدریس کا سلسلہ کب تک جاری رہا، سب پردۂ اخفا میں ہیں۔ ڈاکٹر تارا چند لکھتے ہیں کہ "امیر خسرو تلمیذ الرحمٰن بود" لیکن یہ بات قرینِ قیاس نہیں کہ اتنے اونچے گھرانے میں پیدا ہونے والے بچے کے لیے فاضل باپ اور نامور نانا نے باقاعدہ تعلیم و تدریس کا کوئی معقول بندوبست ہی نہ کیا ہو۔ ڈاکٹر رضا زادہ شفق لکھتے ہیں کہ "بہمان طور کہ پدرش از اہلِ فضل بود خودش نیز بہ تحصیل علوم و فنون پرداخت" باپ کے زمانے میں قاضی اسد الدین خوش نویس سے اکتسابِ فیض کرتے رہے۔ خود لکھتے ہیں کہ میرے والد مجھے مکتب بھیجا کرتے مگر میں ردیف قافیے کے چکر میں پڑا رہتا۔ میرا استاد خوش نویس تھا اور میں مہ جبینوں کی تعریف میں شعر کہتا۔

نانا کی سرپرستی میں آئے تو اور بھی علمی اور عملی مواقع میسّر آئے۔ وہ علم پرور اور دانش گستر انسان تھا، ان کے ہاں علم و فن اور شعر و ادب کی محفلیں

---

[1] خسرو شیریں بیان تالیف اقبال صلاح الدین ص ۲۷، میری لائبریری چاپ ۱۹۷۰

برپا ہوتیں جن میں جید عالم و فاضل اور نامور ادیب و شاعر حصّہ لیتے، اس اُجلے ماحول نے سونے پر سہاگے کا کام کیا۔ ان کی علمی استعداد اور سخن گوئی کے فطری مذاق نے اور بھی نکھار پایا۔ خسرو شیریں بیان کے فاضل مولف کا کہنا ہے کہ گویا تہذیب و تمدن کے اس گہوارے میں خسرو کی تعلیم و تربیت بے قاعدہ مگر سبھی سامان موجود۔ تعلیم و تربیت کے ابتدائی زمانے میں تو شعر و شاعری ہی ان کی توجہ کا مرکز رہی لیکن آگے چل کر غیر معمولی قلب و ذہن کے اس مالک نے اپنی علمی استعداد کو خوب وسعت بخشی۔ خود ان کا کلام شاہد ہے کہ ذاتی کاوش اور مطالعہ سے صرف و نحو، نجوم و ہیئت، فلسفہ و تصوّف اور اخلاق و مذہب جیسے متداولہ علوم پر کامل عبور تھا، مختلف زبانوں پر مکمل دسترس تھی۔ عربی، فارسی، ترکی اور ہندی کے علاوہ فن خطاطی اور موسیقی میں کمال حاصل تھا۔

اپنے دیوان "تحفۃ الصغر" کے دیباچے میں آپ اپنے کم سنی کے زمانے کا ایک واقعہ بیان کرتے ہیں جسے جناب ڈاکٹر وحید مرزا نے یوں نقل کیا ہے[1]:

ابھی دس سال کی عمر نہ تھی کہ ایک دن اُن کے استاد قاضی اسد الدین جو اپنے زمانے کے مشہور خطّاط تھے انھیں اپنی ہمراہی میں قاضی عزّ الدین[2] کے گھر لے گئے۔ یہ قاضی صاحب علم و فضل میں بڑی شہرت رکھتے تھے۔ جب یہ لوگ ان سے ملنے گئے تو وہ نظم کی کسی کتاب میں مصروف تھے۔

---

[1] امیر خسرو تالیف ڈاکٹر محمّد وحید مرزا ہندوستانی اکیڈیمی الہ آباد ۱۹۴۹ء

[2] مولانا شبلی نے قاضی عزّ الدین کا نام خواجہ عزیز الدین لکھا ہے۔ نیز انھوں نے اس واقعہ کا محل خواجہ اصیل کے گھر کو قرار دیا ہے جو کوتوال کے نائب تھے۔

قاضی اسدالدین نے ان سے کہا کہ یہ چھوٹا بچہ میرا شاگرد بھی شاعری میں بہت بلند پروازی کرتا ہے۔ ذرا اس سے بھی ایک دو شعر پڑھوا کر دیکھیے۔ اس پر عزالدین نے ایک کتاب خسرو کے ہاتھ میں دے دی اور پڑھنے کو کہا۔ خسرو نے ایسی شیریں اور مترنم آواز میں پڑھنا شروع کیا کہ سامعین پر ایک وجدانی کیفیت طاری ہوگئی اور ان کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ اس کے بعد قاضی اسدالدین نے کہا کہ شعر پڑھ لینا تو بڑی بات نہیں۔ آپ اس سے کہیے کہ کچھ شعر خود کہہ کر بھی سُنائے تاکہ اس کی ذہانت کا امتحان ہو سکے۔ اس پر خواجہ عزالدین نے چار متفرق چیزوں کے نام لیے جن میں بظاہر کوئی مناسبت نہیں یعنی مُو، بیضہ، تیر اور خربوزہ ـــــ اور کہا کہ ان کو ایک رباعی میں موزوں طریقے سے بیان کرو۔ خسرو نے برجستہ یہ رباعی کہی ؎

ہر موی کہ در دو زلفِ آن صنم است
صد بیضۂ عنبرین براں موی صنم است
چون تیر مدان راست دلش را زیرا
چون خربزہ دندانش میان شکم است

رباعی سُن کر خواجہ انگشت بدنداں رہ گئے اور انھوں نے خسرو کی بے انتہا تعریف کی۔

عملی زندگی کی ابتدا

امیر خسرو اپنی عملی زندگی کی ابتدا میں اکثر دہلی سے باہر گھومتے پھرتے رہے۔ عنفوانِ شباب تک پہنچتے پہنچتے ان کی زندگی کا مقصد متعین ہوگیا تھا۔ دہلی ان دنوں بغداد ثانی بنتا جا رہا تھا۔ جہاں بُرے اور بھلے ہر قسم کے لوگ آباد تھے اور یہ شہر ہر قسم کے فنونِ لطیفہ اور قبیحہ کا گہوارہ بن گیا۔

بقول جناب حیات اللہ انصاری اس دھوپ چھاؤں والے شہر کی حالت امیر خسرو کے طبعی رجحان کو خوب راس آئی۔[1] انھوں نے دِلّی کا ہر رُخ سے معاینہ کیا۔ واعظین کی خطابت اور صوفیا کے پُر کیف مکالمے ہوں یا یہاں کی رقاصاؤں کے دلربایانہ عشوے ان کی نظر سے نہیں بچے، گویا ؎

تمتّع زہر گوشہ ای یافتم زہر خرمنی خوشہ ای یافتم

خسرو نے دربارِ شاہی سے لے کر مزدوروں کی گلیوں تک، خانقاہوں سے لے کر خرابات تک، معاشرتِ انسانی کی تہ بہ تہ حالتوں کا معاینہ کیا۔ وہ درباری شاعر بن گئے۔ شاعر کی مدح و ثنا ممدوح بادشاہ کو مقبولِ عوام بنا دیتی ہے۔ ان شعروں کے ساتھ اس کا نام بھی لوگوں کی زبانوں پر چڑھ جاتا ہے۔ اسی لیے تو رودکی نے کہا تھا کہ ایسے جوہرِ قابل پہ خزانے بھی لٹا دیے جائیں تو مہنگا سودا نہیں ؎

آفرین و مدح سود آید ہمی
گر بگنج اندر زیاں آید ہمی

اور پھر یہ تو دَور ہی بڑا انقلابی تھا جہاں حصولِ اقتدار اور نمود و نمائش کی غرض سے ہر بادشاہ داد و دہش اور فیّاضی میں دوسروں سے سبقت لے جانے کی کوشش کرتا۔

ایک اور محرومیت —— نانا کی وفات

'گئی یک بیک جو ہوا پلٹ نہیں دل کو میرے قرار ہے'

عمادالملک کے سایۂ عاطفت میں امیر خسرو کے دن بڑے آرام و آسائش

---

[1] سوانح حیات امیر خسرو تالیف پروفیسر محمد حبیب علی گڑھ، ص ۷ ہندوستانی اکیڈمی ۱۹۴۸

سے گزر رہے تھے۔ نانا کی بے پایاں شفقت نے باپ کی موت کے صدمے کو محسوس ہی نہ ہونے دیا، اپنے دامن سے وابستہ رکھ کر انھوں نے امیر خسرو کی ہر خواہش، ہر آرزو اور ہر تمنا کا ساتھ دیا۔

امیر خسرو کی زندگی اب تک پھولوں کی اک سیج تھی۔ خارستانِ ہستی کا ایک ایک کانٹا بھی پھولوں کی طرح شاداب تھا مگر نانا کی موت نے امیر خسرو کو بُری طرح درد آشنا کر دیا۔ تلخیٔ حیات کا یہ پہلا کانٹا تھا جس کی چبھن بری طرح محسوس ہوئی۔ اب ہر سُو ویرانی اور اُداسی، سب کچھ ہوتے ہوئے بھی کچھ نہ ہونے کی کیفیت۔ فقط اس لیے کہ وہ چاہنے والے نہ رہے۔ امیر خسرو تو خزاں نادیدہ بلبل تھا۔ خزاں کے ایک ہی جھونکے نے اس کی دُنیا ہی بدل ڈالی۔ اب سینہ بُری طرح غم سے فگار تھا۔

غم جوانی کو جگا دیتا ہے لطفِ خواب سے
ساز یہ بیدار ہوتا ہے اسی مضراب سے

دہلی بدیں بزرگی بگلیم در نگنجد
فرو نور مہ بگوید کہ من اندریں غبارم

غم کا یہ چرکا امیر خسرو کے خفتہ جذبات درد کے لیے بانگِ سحر کا کام کر گیا۔ اب سکونِ قلب کی تلاش ہوتی مگر

ع نہیں ملتا یہ گوہر بادشاہوں کے خزینوں میں

بیعت اوّل کے بعد سے مرشد کی نظرِ عنایت بھی مسلسل اپنا کام کر رہی تھی۔

دہلی کی نواحی بستی غیاث پور جہاں خواجہ محبوب الٰہی نے دکانِ وحدت سجا رکھی تھی، ہمیشہ ان کی نظروں کے سامنے تھی جہاں اس پُر آشوب دور کے نامساعد حالات میں جب کہ ہر سُو الحاد کی ہوائیں چل رہی تھیں اور کفر کی گھٹا ٹوپ گھٹائیں چھائی ہوئی تھیں اور ستم بالائے ستم یہ کہ اکثر بادشاہ جو اپنے آپ کو مسلمان کہتے تھے، خود (نعوذ باللہ) خدائی کا دعویٰ کرتے تھے اور دین داروں کو بے دین بنانے پر آمادہ تھے۔ اور اس دور کے بعض سنہری اور روپہلی مصلحتیں رکھنے والے مولوی بھی ان کی ہاں میں ہاں ملاتے تھے۔ ایک مردِ درویش نے جسے خدا نے انداز خسروانہ بخشے تھے، ان تند و تیز آندھیوں میں رُشد و ہدایت کی شمع روشن کر رکھی تھی۔ جہاں مُریدی کا

دروازہ ہر کس و ناکس پر کھلا تھا، جہاں خواص و عوام ، دولت مند و غریب، امیر و فقیر ، عالم و جاہل ، نرم مزاج اور تند خُو ، شہری و دیہاتی ، آزاد و غلام، سب قسم کے لوگوں کیلیے صلائے عام تھی ، جہاں عورت و مرد ، جوان و پیر، ادنیٰ و اعلیٰ ، خادم و آقا ، چھوٹے بڑے سب یادِ الٰہی میں مصروف رہتے۔ جہاں معاشرے کے بگڑے ہوئے افراد سنور کر صالح افراد میں تبدیل ہو رہے تھے۔ جہاں فضا میں قال اللہ و قال الرسول کے نغمے گونج رہے تھے۔ جہاں خاکی فضا میں رُوح کو بالیدگی ملتی تھی۔ زائرین کا تانتا فقط اس لیے کہ پیرِ مغاں ہے مردِ خلیق۔ جو خرق عادات اور ادنیٰ کرامات کے قائل نہ تھے، نہ ہوا میں اُڑتے ، نہ پانی پر چلتے۔ ان کے کشف و کرامات کا راز تالیفِ قلوب اور شکستہ دلوں کو راحت اور آسائش پہنچانے میں مضمر تھا ، ان کی عظمت کا راز ان کا محبت بھرا دل تھا اور ان کی کرامتیں ان کی ہمدرد اور پُر خلوص رُوح میں پوشیدہ تھیں۔ سبحان اللہ کیا شیخ کامل تھے ، باقی باللہ اور عاشق رسُول اللہؐ۔ دن بدن عروجِ کمال اور مشاہدۂ جمالِ شاہدِ بے زوال، شیخ الشیوخ اور صاحبِ ارشاد ، لیکن طریقہ وہی درویشی اور انتہائی مسکنت۔ ہر کسی سے گھُل مل کر باتیں کرتے ، پھر بھی لوگوں کو یوں معلوم ہوتا تھا کہ شیخ کا دل خدا کی طرف متوجہ ہے گویا وہ ان کو دیکھ رہا ہے۔ ایک نگاہ میں دل کا حال معلوم کر لیتے اور ایسی بات کہتے جس سے مجروح اور مصیبت زدہ دل کو فوراً تسکین ہو جاتی۔

تجدیدِ بیعت

در بکشا کامد خامی دگر   پیشکشی کن دو سہ جامی دگر

وہ چنگاری جو مدتوں سے سُلگ رہی تھی، اب بھڑک اُٹھی ، امیر خسرو

نے جملہ نقد و اسباب خُدا کی راہ میں لُٹایا اور شاہی بالاخانوں کو چھوڑ کر فقیروں کے آستانہ کا رُخ کیا۔ دستِ حق پرست پر باقاعدہ بیعت کی۔ علم و دانش، حکمت و فلسفہ، جاہ و جلال، شعر و موسیقی، مال و منال سبھی کُچھ بکمال ارادت و عقیدت مُرشدِ باکمال کے پاؤں پر نچھاور کر دیا، اب حلقۂ ارادت میں شامل ہو کر فقط مریدِ باصفا اور عاشقِ دلباختہ ہو کر رہ گئے ع ہرچہ جز معشوق باقی جملہ سوخت

چشمِ بینا پسِ پردہ ہر چیز کو دیکھ لیتی ہے۔ مُرشدِ کامل کو کشف سے اُن کی قلبی کیفیت کا علم تھا۔ ان کی رُوحانی صلاحیت سے بھی کماحقہٗ آگاہ تھے۔ اس سے کسے انکار کہ پیاسوں کو کنوئیں کی تلاش ہوتی ہے مگر اس میں بھی کسے کلام کہ خود کنوئیں کو بھی پیاسے کی اِنتظار رہتی ہے ؎

ہر کہ عاشق دیدیش معشوق دان — کُو بہ نسبت ہست ہم این و ہم آن
تشنگان گر آب جویند از جہان — آب ہم جوید بعالم تشنگان
بیدلان را دلبران جُستہ بجان — جُملہ معشوقان شکارِ عاشقان

اُن کی رُوحیں ازل سے آشنا تھیں۔ مدّتوں سے ان پہ خصوصی نگاہ تھی۔ برسوں سے زیرِ تربیت تھے۔ آج راہِ سلوک کا وہ مُسافر آیا جس کا خود منزل کو انتظار تھا۔ یہ بیعت عامیوں کی بیعت سے یکسر مختلف تھی:

ع ما سراپا اِنتظار او مُنتظَر

نگاہیں چار ہوئیں اور دل کے پار اُتر گئیں اور ع اک تڑپ میں منزلوں کے فاصلے جاتے رہے ——— خواجہ محبُوبِ الٰہیؒ بڑی شفقت اور محبت سے پیش آئے۔ نہایت گرم جوشی سے گلے لگایا کہ

ع بیا امیر خسرو کہ تو خاص ازانِ مائی

مرشد نے ایک بارانی اور کلاہِ چہار ترکی عنایت کی۔

آنے والا خود سالکِ باخبر تھا۔ زاہد شب زندہ دار تھا۔ مرشدِ کامل کی عنایت سے امیر خسرو نے معرفت کی جو منازل طے کیں اور تصوّف میں جو مدارج حاصل کیے ان کو نہ ہم جان سکتے ہیں اور نہ بیان کر سکتے ہیں۔ فقط ان کے کلام کی آگہی سے اُن کے مقام کا پتا نہیں چل سکتا۔ یہ مقامِ عشق ہے اور عشق فنا کا نام ہے ع کسی لذت این بادہ نداند کہ نخورد است" یہ بہشتی میوہ ہے بن چکھے اس کا ذائقہ کون بتائے ع شرح عشق و عاشقی ہم عشق گفت

تجدید بیعت خسرو کی زندگی کا اہم سنگ میل ہے۔ مُرشدِ کامل کے فیضانِ نظر اور اپنی ارادت و عقیدت، خلوص و وفا اور مسلسل اجتہاد سے تصوّف اور معرفت کی کٹھن منزلیں پلّہ بہ پلّہ اور پایہ بہ پایہ طے کیں اور بالآخر وہی نسبت قائم ہوگئی جو روم کو تبریز سے یا عراقی کو خواجہ بہاء الدین زکریا سے تھی۔ غزلیات شمس، عراقی یا خسرو کو بنظرِ غائر دیکھیے۔ ہر جگہ مطالب عرفانی نظر آتے ہیں۔ تینوں عارفوں کی غزلیات کا تانا بانا صوفیانہ اور عاشقانہ افکار و خیالات سے مرکب ہے۔ فرق یہ ہے کہ مولانائے روم کے ہاں عشق و تصوّف دونو کا حسین امتزاج ہے مگر بڑی شدت کے ساتھ۔ لیکن خسرو کے ہاں عراقی کی طرح تغزّل کا غلبہ ہے۔ اور بقول مولانا حالی ان کی غزل کا موضوع جیسا کہ ظاہر الفاظ سے مفہوم ہوتا ہے۔ عشق مجازی نہ تھا بلکہ وہ حقیقت کو مجاز کے پردہ میں ظاہر کرتے یا یوں کہو کہ چھپاتے تھے۔ ان کے ایک ایک لفظ سے پایا جاتا ہے کہ وہ عشق و محبت کے رنگ میں شرابور تھے۔

لیکن ان روحانی مدارج کے طریق اور مدّتِ حصُول کا وجدانی اور قیاسی و منطقی جائزہ بھی خالی از دلچسپی نہ ہوگا۔ خوش اعتقاد عوام ایسے انقلابات

کو محض مردانِ حق کے کشف و کمال سے منسوب کر کے نوری و آنی تصور کرتے ہیں ؏ کی ایک ہی نگاہ کہ بس خاک ہو گئے ، اور زیبِ داستاں کے لیے بات کو بڑھا دیتے ہیں۔ وہ علت و معلول کے قائل ہی نہیں ہوتے اور اسباب و علل کے فراہم کیے بغیر نتائج کی تمنا رکھتے ہیں۔ بعض تذکرہ نویس بھی اسی زلف کے اسیر ہو کر رہ جاتے ہیں۔ خود مولانا کے متعلق اکثر ایرانیوں کا یہی طرزِ فکر ہے اکثر و بیشتر عوام کا یہی عقیدہ کہ شمس الدین تبریز آیا اور مولانا کو جو ایک عالم، فاضل، مدرس، مفتی، فقیہہ اور خشک زاہد تھے ایک ہی چلہ میں عارفِ کامل اور شاعرِ باکمال بنا کر چلا گیا۔

شمس تبریزؒ سے ملاقات کے وقت مولانا عمر کے چالیسویں سال میں تھے۔ بالفرض اگر یہی کہا جائے کہ اُنتالیس سال تک مولانا شاعر نہ تھے۔ انھیں فن شاعری سے کوئی سروکار نہ تھا۔ یہ ہنر انھیں محض برکاتِ عشق ہی سے ملا تو بظاہر مُحال نظر آتا ہے مگر عشق کی معجزنما قوتوں سے انکار کرنا بھی آسان نہیں

؏ عشق ازیں بسیار کرد ست و کُند

آخر عشقِ حقیقی توفیقِ ربانی ہی کا مظہر تو ہے اور اس سے بھی کیسے انکار کہ مولانا کے ہاں سب کچھ لیا دیا تبریز ہی کا تو ہے۔ یہ سب انہی کا فیضانِ نظر تھا۔ مولانا کی کایا انہی نے پلٹی۔ یہ بات سرے سے خارج از بحث سمجھیے۔ سوال تو مفروضہ کے دوسرے حصے سے ہے کہ آیا ۳۹ سال تک مولانا شعر اور ماہیت و اصلیتِ شعر سے محض نابلد تھے، جس آدمی نے ۳۰ ہزار شعر کے لگ بھگ پر مشتمل دیوان غزلیات اور ۲۶ ہزار مثنوی کے اشعار

کہے ہوں۔ اس کے متعلق یہ فتویٰ بھی کچھ زیادتی ہے کیوں نہ اس کی سادہ سی توجیہہ و تشریح کر لی جائے جو نہ خوش اعتقادوں پر گراں گزرے اور نہ ہی عقل کی کسوٹی پر پرکھنے والوں کو شاق گزرے۔ ٹھیک ہے مولانا ۳۹ سال تک شاعر نہ تھے بلکہ وہ شعر و شاعری سے بیزار تھے، لیکن اس امر کے تسلیم کرنے میں کیا حرج اور کون سی بات مانع ہے کہ خدا نے شعر کہنے کا ملکہ انھیں ودیعت کر رکھا تھا۔ ذوقِ شعر و شاعری ان کے خمیر میں تھا لیکن عملی زندگی کی دوڑ میں ان کی راہ مختلف تھی۔ علم و عرفان، زہد و عبادت و ریاضت اور سیر و سلوک سے انھیں اتنی فرصت ہی کہاں تھی کہ وہ اس ہنر کا اظہار کرتے۔

شمس تبریز سے ملاقات سے پہلے بھی مولانا ایک کامل انسان تھے، عالم، فاضل، واعظ، مدرس، مفتی، فقیہہ، عارف، عارفِ محقق، صاحبِ کشف و شہود، شیخ حتیٰ کہ قطب، ہر لحاظ سے ایک پختہ کار انسان ــــ شمس آئے تو یہ سب کچھ نچھاور اور عاشق فقط عاشق پاکباز بن کر رہ گئے۔ مولانا نے خود اسے ایک ہی مصرع میں سمو دیا ہے ع "خام بُدم، پُختہ شدم، سوختم" گویا بقول ان کے جلنے سے پہلے وہ پختہ تھے۔ قابلِ سوختن تھے، اُن میں کوئی نم نہ تھا، بالکل خشک ایندھن جسے فقط اک آنچ کی ضرورت تھی جو تبریز کی شکل میں ملی۔

حاصلِ مطلب یہ کہ وہ شعر کہتے نہیں تھے، چاہتے تو کہہ سکتے تھے اور جب عشق آیا تو ہیئت ہی بدل گئی۔ زہد و اتقا کی سردی اور خشکی گئی۔ وجد و سماع اور جوش و خروش کی گرمی آئی اور پھر شعر و شاعری کا دَور :

ع خون چو می جوشد منش از شعر رنگی میدہم

بعینہٖ یہی حال امیر خسرو کا ہے۔ ان کے وجود میں بھی وہ چنگاری موجود تھی مگر بوجوہ دبی ہوئی تھی، وہ بھی مولانا کی طرح ایک بھرپور زندگی گزار رہے تھے۔ عاشق زار بننے سے پہلے وہ سپاہی بھی تھے اور عالم بھی، دنیا دار بھی تھے اور پکے دین دار بھی، عابد بھی تھے اور زاہد بھی، شاہی ندیم بھی تھے اور مصاحب بھی۔ شاعر بھی اور عالی مقام موسیقار بھی۔ بلکہ حیرانی ہوتی ہے کہ انھیں سپہ گری، درباداری، شعر گوئی، دنیاداری اور عبادت و ریاضت کے لیے وقت کہاں سے مل جاتا تھا۔ تصوف و درویشی کی چنگاری موجود تھی مگر دبی ہوئی تھی جیسے مولانا کے ہاں شاعری، اسے فقط ہوا دینے کی ضرورت تھی اور وہ ہوا انھیں مرشدِ کامل کے دامن سے مل گئی اور یوں جب وہ سُلگ اٹھی تو سلگ اٹھی اور وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ وہ بھڑک اُٹھی۔ وادیٔ ایمن میں پہنچ کر یہ سب شرر باریاں اسی چنگاری کی تھیں۔

اب اگر خوش اعتقادی سے یہ تسلیم کر لیا جائے کہ ایک ہی نگاہ میں یہ سب مراحل آناً فاناً طے ہو گئے تو اس سے نہ مُرید کی عظمت بڑھتی ہے اور نہ مُرشد کی، اور شاید مرشد عالی مقام کا یہ شیوہ بھی نہ تھا۔ وہ تو تالیفِ قلوب کے قائل تھے۔ دلوں میں جوت جگا دیتے تھے۔ وہ پاکباز مُرشد شبنم کی طرح پاک اور لطیف تھا۔ امیر خسرو کے اندر کا پھول عمر بھر اسی شبنم سے تابانی اور تازگی حاصل کرتا رہا اور یوں امیر نے تصوف و معرفت کے مدارج زینہ بہ زینہ طے کیے اور بقول مولانا روم ؎

از مقامات تبتّل تا فنا
پایہ پایہ تا ملاقاتِ خدا

پیر روشن ضمیر کی نظرِ عنایت ان پہ ابتدا سے تھی اور انتہا تک رہی۔

بعض تذکرہ نویسوں نے جو یہ لکھا ہے کہ ابتدائی دور میں دونوں کی طبائع میں زمین آسمان کا فرق تھا[1]، کچھ قرینِ قیاس نظر نہیں آتا۔ ہمارا مفروضہ یہ ہے کہ طبائع نہیں، راہیں مختلف تھیں۔ شواہد موجود ہیں کہ طبائع میں تو زبردست ہم آہنگی پائی جاتی تھی، اس ہم آہنگی کی چند کڑیاں ملاحظہ ہوں :

چیست دنیا از خدا غافل بُدن
نی قماش و نقرہ و فرزند و زن

امیر خسرو نے ایک ایسے خاندان میں جنم لیا جس کا مذاق عارفانہ تھا۔ ان کے ددھیال اور ننھال، سبھی خواجہ محبوب الٰہی کے دستِ حق پرست پر بیعت کا شرف حاصل کر چکے تھے خود امیر خسرو کے خیالات بچپن ہی سے صوفیانہ تھے۔ ٹھیک ہے امیر خسرو کی ابتدائی زندگی ناز و نعم اور درباری فضا میں گزری مگر تکبر و غرور کا ان میں شائبہ تک نہ تھا، دنیا داری کے ساتھ ساتھ دین داری کا کوئی گوشہ بھی تو میل کھاتا ہوا نظر نہیں آتا۔ ادھر شیخ حق پرست کی رواداری بھی ضرب المثل تھی۔ ان کی نگاہِ حق بیں سے یہ بات پوشیدہ نہ تھی کہ دنیا داری کے ساتھ ساتھ اگر دل مائل بہ حق ہو تو دینداری میں کوئی فرق نہیں آتا ؎

دگر مال و جاہ ہست و زرع و تجارت
چو دل با خدائیست خلوت نشینی

امیر خسرو کی عبادت، ریاضت، جود و سخا، ہمدردیٔ خلق اللہ کا جذبہ بھی ان سے پوشیدہ نہ تھا۔ امیر کی ذات سراپا پیکرِ محبت تھی۔ پہلو میں دل تھا،

---

[1] حیاتِ امیر خسرو تالیف پروفیسر محمد حبیب علی گڑھ، ص ۲۸/۳۷، ہندوستانی اکیڈیمی الہ آباد، ۱۹۴۸ء

دلِ زندہ، جس میں سوز تھا، گداز تھا اور عشق کی لازوال کسک۔ عشقِ خدا و رسولؐ ان کے روئیں روئیں میں سمایا ہوا تھا۔

گویا اِدھر شیخِ باکمال، راہ سلوک کی منزلوں کے شناسا، اُدھر امیر خسرو راہِ سلوک کی مسافرت پر دل و جان سے آمادہ۔ اور لیجیے، امیر خسرو اعلیٰ پایہ کے شاعر، تو دوسری طرف شیخِ باکمال خود بھی اعلیٰ درجے کی رباعیاں کہتے تھے اور خسرو کی گرمی کلام پر فریفتہ تھے اور بڑے ذوق و شوق سے ان کی غزلیات لوگوں کی زبانی سُنتے۔ ایک طرف محبوبِ الٰہی سماع کے دلدادہ، ان کے نزدیک سماع ایک صوتِ موزوں، جس سے تحریکِ قلب ہوتی ہے۔ یہ تحریک اگر یادِ حق کے لیے ہو تو عین مستحب، دوسری طرف امیر خسرو کے گلے میں نُور، خدا نے انھیں لحنِ داؤدی عطا کیا تھا، آج تک ان کے پایہ کا موسیقار اس سرزمین سے پھر نہیں اُٹھا، اُدھر امیر خسرو ایک باغ و بہار قسم کے آدمی، خوش مذاق، خوش بیان، خوش الحان اور بذلہ سنج، اِدھر خواجہ صاحبؒ کی خاص صفت کہ زہد و تقویٰ کے ساتھ ساتھ زندہ دل بھی تھے، وہ مذہبی تقشّف، جو بعض خشک زاہدوں میں پیدا ہو جاتا ہے، آپ میں نام کو نہ تھا۔ اب غور کیجیے کہ ہم آہنگیٔ طبائع کی کتنی نسبتیں مشخص ہو گئیں۔

قصۂ مختصر یہ کہ یہاں خانقاہ میں اس ارادت مندی سے آنے پہ امیر خسرو کی کایا پلٹ گئی، وہیں خانقاہ کی ساکن فضا میں بھی ان کے آنے سے اک مختلف دنیا کی نسیمِ خوشگوار کا جھونکا آیا۔ ساری فضا مُسکرا اُٹھی۔

درمیان قعر دریا تختہ بندم کردہ ای
باز میگوئی کہ دامن تر مکن ہشیار باش

اب دن دنیاوی بادشاہ کے دربار میں بسر ہوتا اور رات شہنشاہِ دین کی سرکار میں کٹتی، اس زمانے کی سیاہی فضا میں جو راہ امیر خسرو چل رہے تھے، بہت خطرناک ہوگئی تھی۔ مگر وہ جتنے صاحبِ دل تھے، اتنے ہی عالی دماغ اور معاملہ فہم بھی تھے۔ ان کی دانش و فراست کا اس سے بڑھ کر اور کیا ثبوت ہوگا کہ جو بادشاہ خواجہ محبوب الٰہی کے جانی دشمن تھے، ان کے سر کی قیمت مقرر کر رکھی تھی، امیر خسرو ان کے بھی چاہیتے اور منظورِ نظر تھے۔

ہمیشہ نشیب و فراز کو دیکھ کر اور پھونک پھونک کر قدم اُٹھاتے اور وہ دور بھی کچھ ایسا انقلابی دَور تھا کہ اپنی عمر میں گیارہ بادشاہوں کی حکومت دیکھی۔ ان میں سے سات کی ملازمت کی اور چار بادشاہوں کے منظورِ نظر بھی رہے لیکن ان پہ اعتماد نہ کرتے۔ ان کا مشہور مقولہ ہے کہ جو لوگ صاحب عقل ہیں، وہ آگ، پانی اور حاکم پر اعتماد نہیں کرتے۔

ان کے لیے یہ بڑی آزمائش کا زمانہ تھا۔ کتنا مشکل کام ہے اور کتنا کٹھن مرحلہ کہ ایک آدمی شاہی مصاحب اور ندیم بھی ہو اور سیاسی گتھیوں میں نہ اُلجھے

مگر امیر خسرو نے انتہائی فہم و فراست سے کام لیتے ہوئے اپنے آپ کو اپنے مربّی کے سیاسی جھگڑوں سے الگ رکھا اور اس سلسلے میں کبھی اپنے دامن کو ملوّث نہ ہونے دیا۔ شاید اس کی سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ انھوں نے نہ تو کبھی دوسروں کی بلندیوں پر حسد کیا اور نہ ہی سر چکرا دینے والی بلندی پر چڑھنے کی خود کبھی تمنّا کی۔ یہ معاشی جھنجھٹ تھا۔ اس لیے تعلقات کو کاروباری سطح سے کبھی آگے نہ لے گئے۔ دنیا کی کشاکش سے کبھی کنارہ کش ہونے کی خواہش نہ کی۔ وہ فقط شاعر اور ادیب ہی نہ تھے، صاحب شمشیر بھی تھے اور تلوار کو بھی اسی طرح جنبش دے سکتے تھے جس طرح قلم کو، ان میں ہر حال میں خوش رہنے کی خاص صلاحیت تھی۔

اب ان کی کیفیت بالکل اس پرندے کی سی تھی جو علی الصبح نور کے تڑکے روزی کی تلاش میں توکلت علی اللہ اُڑ جاتا ہے۔ فضا کی لامتناہی وسعتوں میں گھومتا رہتا ہے مگر اس کی نگاہ ہمیشہ آشیانے پر رہتی ہے جہاں اس نے پھر شام کو بسیرا کرنا ہے۔ خسرو شاہی محلوں میں ہوں یا دربار میں، سفر میں ہوں یا حضر میں، ان کا دل ہمیشہ خانقاہِ محبوب الٰہی میں اٹکا رہتا تھا۔

نہ دوری دلیلِ صبوری بود
کہ بسیار دوری ضروری بود

اگرچہ وہ سلطان المشائخ سے ایک دم کے لیے بھی جُدا ہونا نہ چاہتے تھے، ان کو شاہوں اور شہزادوں کے ہمراہ دور و نزدیک جانا ہی پڑتا تھا۔ اب اُن کا مقام دورانِ باخبر والا تھا، وہ ایسے مقام پر جا پہنچے تھے جہاں سب فاصلے سمٹ کر رہ جاتے ہیں۔ قرب و بُعد کی تخصیص نہیں رہتی۔

کچھ عرصہ لکھنوتی رہے مگر ادھر کی آب و ہوا راس نہ آئی پھر دہلی لوٹ

آئے، اور پھر خوش قسمتی سے شہزادہ محمد جیسا مربی مل گیا جو سب مربیوں سے زیادہ قدر دان، سخن شناس، شعر دوست، علم پرور اور فیاض تھا۔ بڑا ہی مہذب، شعرا و صوفیا کا دلدادہ، اور فنونِ لطیفہ کا قدر دان تھا۔ اُس کی اپنی بیاض میں ہزاروں شعر تھے۔ جنھیں سُن کر بڑے بڑے عالم فاضل اس کے حُسن انتخاب کی داد دیتے۔ برّصغیر کی مغربی سرحدوں پر منگولی طوفان منڈلانے لگا تو بلبن نے سرحدوں کی دیکھ بھال نوجوان شہزادے کے سپرد کی۔ ۱۲۸۰ء میں جب وہ ملتان گیا تو امیر خسرو کو بھی خلعتِ شاہی عطا کر کے ایک اعلیٰ عہدے پر فائز کر کے اپنے ہمراہ لیتا گیا، شہزادہ محمد کا یہ دربار ملتان فارسی دان دنیا میں مشہور ہے۔ وہاں پانچ سال رہے۔ بڑی قدر و منزلت تھی۔ بڑی عزّت و آبرو تھی۔ بڑے ٹھاٹھ باٹھ تھے۔ علمی، ادبی اور شعر و سخن کی مجالس برپا ہوتیں۔ امیر حسن دہلوی جیسے یارِ غار کی صحبت بھی نصیب تھی مگر دل دہلی میں اٹکا ہوا تھا۔

مسکن شاہ ہست و شہر یار ما

دہلی کا نقشہ بڑے حسرت ناک پیرائے میں کھینچتے ہیں[1] کہ دہلی میرے لیے بہشت بریں ہے۔ جہاں سر بفلک عمارات ہیں۔ جہاں بازاروں میں ہر وقت چہل پہل رہتی ہے، جہاں دریا کا بہتا ہوا شفاف پانی ہے جس کے باغوں کے پھلوں میں بہشتی میووں جیسی شیرینی ہے اور جہاں محبوب کی صحبت میسر ہوتی ہے۔ غور کریں تو صاف پتہ چل جاتا ہے کہ مقطع ہی میں سخن گسترانہ بات آپڑی ہے۔ اسی آخری جملے پر آکر تان ٹوٹتی ہے کہ

---

[1] حضرت امیر خسرو، تالیف خان بہادر محمد تقی خاں خورجوی، ص ۲۹/۳۰ چاپ ٹائمز پریس۔ کراچی

جہاں محبوب رہتا ہے۔ شاہی وُرود سے تو جنگل میں منگل ہو جاتا ہے۔ پھر مُلتان تو بڑا قدیمی شہر تھا۔ وہاں بھی بازار، عمارات اور پھل، فروٹ ہوں گے۔ بزرگانِ دین کا شہر، ان دنوں خود خواجہ صدرالدین عارفؒ موجُود تھے، مگر وہ تو کسی اور پھول کی خوشبو سے مست تھے اور ع آن گلی را رنگ و بوئے دیگری

گویا وہاں فقط وہی چیز نہ تھی جسے ان کی آنکھیں ڈھونڈتی تھیں، اس لیے مُلتان اپنی تمام تر رنگینی و رعنائی کے باوجود اُن کے لیے مقامِ مجبوری تھا۔ انھیں تو ایک ہی لگن تھی، کس شدّتِ جذبات سے پکارتے ہیں ؎

آفاق ہا را دیدہ ام مہر بتان ورزیدہ ام
بسیار خوبان دیدہ ام لیکن تو چیزی دیگری

مگر فلک ناہنجار کو یہ محفلیں بھی پسند نہ آئیں۔ ہلاکو خاں کا پوتا فتح دیپال پور کے بعد آگے بڑھا۔ سلطان محمد کو شکست ہوئی۔ یہ بھی ہمرکاب تھے، منگولوں کے ہاتھ پڑ گئے مگر قسمت نے یاوری کی اور انھیں فرار کا موقع مل گیا، مہربان مربّی اور فیاض آقا کی شہادت۔ منگولوں کے ظلم و ستم کو کانوں سے سُنا تھا، اب آنکھوں سے دیکھا اور دل کی گہرائیوں سے محسوس کیا — یہ آپ بیتی تھی، بُوڑھی اور بیوہ ماں کی پریشانی کا خیال کھائے جاتا تھا، گرتے پڑتے دہلی پہنچے، حشر انگیز مرثیہ لکھا، جسے فارسی شاعری کا دُرِ یتیم کہا جاتا ہے۔

خدا معلوم امیر خسرو کے کتنے جانی یار ہوں گے، جو اس ہنگامے میں اُن سے ہمیشہ کے لیے بچھڑ گئے، وہ کیسی کیسی صورتیں ہوں گی، جنھیں وحشی منگولوں کی یلغار اور تلوار نے خاک میں پنہاں کر دیا۔ اس سانحۂ جانکاہ نے امیر خسرو کے دل کو پاش پاش کر دیا۔ کس دردناک لہجے میں کہتے ہیں:

"چمن میں رنگ رنگ کے پھول کھلے ہیں، مگر میرا دل

گلاب کی کلی کی طرح خون ہے۔"

ساحل کی تمنّا اور بڑھی

غم کی اس منزل نے کتنے ہی حقائق کھول دیے ہوں گے اور وہ انابت، خشوع، خضوع، تضرّع اور توکّل جو تصوّف کے خاص مقامات ہیں، عبور کر گئے ہوں گے۔ دل کی دُنیا عجیب دُنیا ہے

ع شکستہ ہو تو عزیز تر ہے نگاہ آئینہ ساز میں

اب اور سکونِ قلب کی ضرورت تھی۔ خواجہ کے دامن سے لگ کر بیٹھ گئے۔ وہیں امان ملی۔

نظام الدین اولیاؒ اور روحانی نظام

عجب پُرآشوب دَور تھا، اُدھر سقوطِ بغداد سے خلافت اسلامی کا خرقہ تار تار ہو گیا۔ مسلمانوں کے خون سے ہولی کھیلی گئی، ع ہو گیا مانندِ آبِ ارزاں مسلماں کا لہو۔ اِدھر برِّصغیر پاک و ہند کی سرحدوں پر بھی وہی خطرہ منڈلا رہا تھا۔ اندرونِ ملک سیاسی کش مکش اور خلفشار، عجب بے سکونی اور بے اطمینانی کا دَور دَورہ تھا۔ یہ بجھی بجھی اور گھٹی گھٹی فضا تصوّف کے لیے سازگار تھی۔ صوفیا نے یہ سب کچھ دیکھا ـــــ مسلمانوں کی سیاسی تباہی دیکھی اور ذہنی پریشانی ـــــ اب اسلام کی صحیح خدمت کا وقت آن پہنچا تھا ـــــ

سیاسی شکست سے ذہنی انتشار کہیں بڑھ کر خطرناک ہوتا ہے، جو قوموں کو گھن کی طرح کھا جاتا ہے اور اس کا مداوا بقولِ اقبالؔ

ع علاج اس کا وہی آبِ نشاط انگیز ہے ساقی

اور یہ آبِ نشاط انگیز صوفیا کی خانقاہوں ہی میں تھا۔ وہی ان کے ذہنوں سے شکست اور انتشار کے آثار کو محو کر سکتے تھے، خواجہ محبوب الٰہی نے اپنے دادا پیر خواجہ معین الدّین چشتی کے مشن کو جس حُسن و خوبی سے جاری رکھا اور مسلمانوں کے ذہنوں کو پھر ایک مرکز پر لانے، معاشرہ کے فاسد

اور گمراہ عناصر کی اصلاح اور انسانیت کی اخلاقی سطح کو بلند کرنے کے لیے جو دلکش اور جاذبِ نظر طریقہ اختیار کیا، اس کی مثال ڈھونڈے سے نہیں ملتی۔ روحانی نظام کو وہ فروغ بخشا کہ باید و شاید۔ اپنے معاصرین پر جتنا اُن کا اثر و رسوخ تھا، اس کی مثال تاریخ میں کہیں نہیں ملتی۔ آپ فقط زاہدِ خشک اور عابد شب زندہ دار ہی نہ تھے، وہ خلیق و ملنسار بھی تھے، خوش طبع، زندہ دل، سخن فہم، سخن شناس، شعر و سماع کے دلدادہ۔ بڑی ہی جذاب اور جامع کمالات شخصیت تھی۔ روحانیات کے بادشاہ ہونے کے ساتھ ساتھ ماہر نفسیات بھی تھے۔ دکھیا دلوں کو ٹٹول کر ان کے دکھوں تک پہنچنے کی کوشش کرتے۔ انسانی دماغ کے پوشیدہ گوشوں تک پہنچ جاتے اور اشاروں ہی اشاروں میں آنے والے کے دل و دماغ کو مسخر کر لیتے۔

اس بصارت اور بصیرت کا سرچشمہ ایمان و عمل کی قوت سے اُبلتا تھا، آنکھوں سے شرافت کی آبشاریں پھوٹتی تھیں۔ نگاہ میں ایسی تاثیر تھی کہ جسے ذرا توجہ سے دیکھ لیتے، اس کی زندگی میں گناہ و معصیت کے سوتے خشک ہو جاتے ان کی ساری کامیابی کا راز تالیف قلوب میں ہے۔ فرمایا کرتے تھے، قیامت کے بازار میں تالیف قلوب اور مسلمانوں کے دلوں کو راحت و آسائش پہنچانے سے بڑھ کر کوئی قیمتی متاع نہ ہوگا۔

خاکساروں سے خاکساری تھی

کردار کی بلندی کا یہ عالم تھا کہ خاکساروں سے خاکساری تھی مگر سربلندوں سے انکسار نہ تھا۔ ہر کسی کی کڑوی کسیلی بڑے تحمل اور صبر و سکون کے ساتھ سُنتے اور سب مطالبات پورے کر دیتے۔ ایک دفعہ ایک سائل آیا اور بڑی ٹیڑھی بیڑھی باتیں کرنے لگا۔ حتیٰ کہ گستاخی پر اُتر آیا۔ آپ نے نہ فقط

اس کی ساری باتوں کو بڑے صبر و تحمّل اور خندہ پیشانی سے سُنا بلکہ اُس کے سب مطالبات بھی پورے کر دیے۔ وہ چلا گیا تو حاضرین سے کہنے لگے: حیران کیوں ہو، میرے مُرشد بابا فریدؒ کے پاس ایسا ہی ایک آدمی آیا اور اس سے بھی دو قدم آگے نکل کر گالی گلوچ پر اُتر آیا، مگر بابا خاموشی سے سُنتے رہے۔ کہنے لگا: اب بُت بن کر چُپ سادھے بیٹھے ہو۔ بابا نے فقط یہ کہا کہ "من نساختہ ام ایں بُت را خدا ساختہ است" پھر اس کے سب مطالبات بھی خوشی خوشی پورے کر دیے۔) زائرین اور عقیدت مندوں کا ہجوم رہتا جس میں ہر فکر و خیال اور مذہب و ملّت کے لوگ شریک ہوتے۔ مگر وہ سب سے یکساں سلوک کرتے۔

یا وہ تنگی و عسرت کا زمانہ تھا اور یا یہ کشایش و فراخی کا۔ ہر جگہ سے نذرانے آتے مگر وہ بڑی فراخ دلی سے محتاجوں اور مسکینوں میں تقسیم کر دیتے، ہر روز بالعموم اور جمعہ کی نماز سے پہلے بالخصوص نعمت خانے کا جائزہ لیتے اور جو کچھ ہوتا، تقسیم کر کے نماز پہ جاتے۔ مہمانوں کے سامنے مرغن کھانے رکھے جاتے مگر خود صائم الدہر تھے۔ روٹی اور سادہ ترکاری سے افطار کرتے، کسی نے اگر اس سلسلے میں کچھ کہا سنا تو فرمایا مسجدوں میں اور بازاروں میں دکانوں کے سامنے اتنے غریب مفلوک الحال فاقہ مست پڑے ہیں، میرے لیے تر نوالہ حلق سے نیچے اُتارنا مُحال ہے۔

وسعتِ اخلاق کا یہ حال کہ دُشمن سے بھی انتقام لینے کا خیال تک نہ آتا۔ ان کا ہر فعل عین رضائے حق کے مطابق ہوتا۔ وہ کسی مخالف انسان سے کبھی نہ ڈرتے۔ جن مخالفوں نے ٹکر لی، انھوں نے منہ کی کھائی۔ ان کے پاس، سوائے نامِ خدا کے اور کچھ نہ تھا، نہ زر و جواہر، نہ مال و دولت، نہ فوج

نہ سامانِ حرب۔ لیکن وہ قوت ضرور تھی جو فرعونی لشکر کو بے حرب اور کلۂ نمرود کو بے ضرب توڑ پھوڑ دے۔ انھوں نے اپنے خدا کے حضور میں سر جھکا کر بڑے بڑے جابر بادشاہوں کو سر جھکانے پر مجبور کر دیا۔

اب خانقاہ کی دنیا ہی اور تھی، دنیا کے اس تپتے اور چلچلاتے ہوئے بیابان میں اس شجرِ سایہ دار کی گھنی چھاؤں میں سستانے اور ٹھنڈے میٹھے چشمے سے سیراب ہونے کے لیے اِک دُنیا کھنچی چلی آتی تھی اور تاریخ گواہ ہے کہ بڑے بڑے زور آور حکمرانوں کی تلواریں اور ان کا رُعب و دبدبہ جو کام نہ کر سکا، وہ ان بزرگوں کے کردار کی بلندی، شخصیت کی جاذبیت اور شیریں بیانی نے کر دکھایا۔

دل پادشاہان لرزد ز گدائے بے نیازے

امرا، روسا، اور سلاطین سے بے نیازی شیخ کے کردار کا طغرائے امتیاز تھا۔ عہد علائی میں امرا بھی خانقاہ میں آنے جانے لگے۔ آپ کو یہ آمد و رفت اگرچہ ناگوار تھی مگر ملنے سے کبھی انکار نہ کرتے۔ کسی کی دل شکنی ان کا شیوہ ہی نہ تھا۔ جوں جوں شیخ کی شہرت پھیلتی گئی، امرا، روسا میں معتقدین کی تعداد بھی بڑھتی چلی گئی۔ اس دور میں ان کی شہرت اوج کمال کو پہنچ چکی تھی۔ حتیٰ کہ ولی عہد سلطنت بمعہ شاہی خاندان کے آپ کے حلقۂ ارادت میں آ گیا۔ خود امیر خسرو لکھتے ہیں کہ " خضر دستش گرفت و خضر خاں پای "

ارباب حکومت کی طرف سے ان کی بے توجہی کا یہ حال تھا کہ خود علاء الدین خلجی جیسے جابر بادشاہ نے انھیں ایک خط لکھا جس میں تمام معاملات میں ان کی رائے و مشورے پر کاربند ہونے کا وعدہ کیا تھا۔ جب ولی عہد نے وہ خط دیا تو شیخؒ نے کھولا تک نہیں۔ اللہ اللہ کیا شانِ بے نیازی ہے کہ خضر خاں سے صرف یہی کہا کہ " رموزِ سلطنت خویش خسروان دانند " درویشوں کو اُن سے کیا سروکار؟ اور ہاں! اگر کوئی اور بات ہے تو بادشاہ سے کہہ دیجیے " مُلکِ خدا تنگ نیست "۔ خود علاؤالدین کبھی کبھار دُعا منگوانے کی غرض سے خانقاہ ضرور آ نکلتا۔

بعض بادشاہ ان کی بڑھتی ہوئی مقبولیت اور سرکار دربار سے کم التفاتی پر خائف ہو کر بدگمان ہو گئے۔ مبارک شاہ تخت نشین ہوا تو خود روحانی پیشوائی کا دعویٰ کیا۔ انا ولاغیری کا نعرہ لگایا، خواجہ محبوب الٰہیؒ کا بڑھتا ہوا اقتدار اُسے ہر دم کھٹکتا تھا۔ ان کی دربار میں حاضری کی تمنا جب کسی صورت پوری ہوتی نظر نہ آئی تو اوچھے ہتھیاروں پر اتر آیا، خواجہ کی اہمیت کو کم کرنے کے لیے ملتان سے شاہ رکن الدین عالم نوریؒ کو بُلایا اور خواجہ کے خلاف جذبۂ رقابت کو ہوا دینا چاہی۔ غافل انسان کو کیا خبر کہ وہ بھی تو شمعِ رسالت کے پروانے تھے۔ وہاں رقابت کہاں؟ اسے کیا پتہ کہ ؎

محبت چون تمام افتد رقابت از میان خیزد
بطوف شعلہ ای پروانہ با پروانہ می سازد

یہاں بھی ناکامی ہوئی تو اس مستِ مئ پندار نے خواجہ کا سر لانے والے کے لیے ایک ہزار ٹنکے طلائی کا انعام[1] مقرر کیا لیکن

ع دشمن چہ کند چو مہربان باشد دوست

ہر طرف سے منہ کی کھائی تو بپھر کر اعلان کر دیا کہ ماہ رواں (جمادی الاوّل) کی آخری تاریخ تک دربار میں حاضری نہ دی تو خانقاہ کی اینٹ سے اینٹ بجا دوں گا۔

معتقدین کو تشویش لاحق ہوئی مگر آپ کے ماتھے پر شکن تک نہ آیا بعض نے مشورہ دیا کہ شاہی حکم کو مان لیا جائے مگر جس دل میں خُدا کا خوف

---

[1] حضرت امیر خسرو تالیف خان بہادر نقی محمد خاں، صہ ۴۴/۴۵
چاپ ٹائمز پریس کراچی

سما گیا ہو، وہاں شاہی خوف و ہراس کا کیا گذر۔ آپ نے انکار کر دیا۔ اس تاریخ سے ایک دن پہلے پھر مریدوں نے زور دیا مگر آپ نے فرمایا مترس از بلائی کہ شب درمیان است۔ آخر جمادی الاول کی آخری تاریخ بھی آئی۔ دن چڑھا مگر اس کے ختم ہونے سے پہلے مبارک شاہ کی اپنی زندگی کا خاتمہ ہو گیا۔

ہنوز دِلّی دُور است

خواجہ صاحب کی زبان حق بیان سے نکلی ہوئی یہ مثل زبان زدِ ہر خاص و عام ہے۔ پڑھے لکھے اور ان پڑھ سبھی استعمال کرتے ہیں۔ آنے والا بادشاہ غیاث الدین تغلق بھی اقتدار کے نشے میں بدمست تھا۔ اس نے اپنے پیشرو کے حشر سے بھی کوئی سبق نہ سیکھا۔ اس کی بدگمانی میں کچھ اور عنصر بھی کارفرما تھے۔ وہ خسرو خان کو ٹھکانے لگا کر تخت پر براجمان ہوا تھا۔ خسرو خان خواجہ صاحب کا دل و جان سے ارادت مند تھا۔ اس نے خانقاہ کے لیے بڑی رقومات بطور نذرانہ دی تھیں۔ خزانہ خالی پا کر بادشاہ نے پیغام بھیجا کہ وہ خسرو خاں کی غلط بخشی تھی، رقم واپس کر دی جائے حالانکہ وہ جانتا تھا کہ مال در دستِ قلندراں قرار نگیرد۔ ان کے استغنا اور جود و سخا سے بھی خوب واقف تھا کہ جو کچھ آتا ہے، ہاتھوں ہاتھ خدا کی راہ میں محتاجوں اور مسکینوں میں بٹ جاتا ہے۔

ان کے استغنا کے دلّی کے گلی کوچوں میں چرچے تھے۔ ابھی کل کلاں کی بات تھی کہ سلطان علاؤالدین خلجی نے ورنگل کی خوشی میں خانقاہ کے لیے ۵۰۰ اشرفیاں بھیجیں۔ اتفاق کی بات کہ اس وقت حاضرین میں ایک خراسانی قلندر بھی موجود تھا، اشرفیوں کو دیکھ کر کہنے لگا "اَلْھَدَایَا مُشْتَرَک" (یعنی ہدیہ مشترک ہوتا ہے) آپ نے ہلکے سے تبسم کے ساتھ

فرمایا[1] "تنہا خوشترک"۔ (یعنی اگر ایک ہی شخص کو دے دیا جائے تو وہ اس سے بھی بہتر) اور یہ کہہ کر سب کچھ قلندر کے حوالے کر دیا۔

ان کے پاس گزشتہ رقوم کا بہی کھاتہ کہاں تھا، جواب دیا وہ تو سب حق دار لے گئے۔ اسے جواب ناپسند آیا۔ بدگمانی اور بڑھی۔ اسی دوران سنارگاؤں کی مہم آن پڑی، بادشاہ نے اُدھر کا رُخ کیا۔ امیر خسرو کو اپنے ساتھ لے گیا اور جاتے وقت یہ حکم دے گیا کہ میری واپسی سے پہلے دور چلے جانا، ورنہ خیر نہ ہوگی۔ مگر آپ نے سن کر فرمایا کہ خیر و شر کا مالک تو کوئی اور ہے۔ معتقدین کو پھر فکر دامنگیر ہوئی۔ بادشاہ اس مہم سے واپس لوٹا۔ دہلی کے نزدیک پہنچ کر آخری پڑاؤ تھا۔ محمد تغلق نے افغان پور کے قریب استقبال کی غرض سے اک عارضی عمارت تعمیر کروائی اور استقبال کے لیے آگے بڑھا۔ ادھر مُریدوں کو سخت تشویش تھی مگر خواجہ صاحب اسی اطمینان اور سکون سے اپنے معمولات اور مشاغل میں مصروف تھے۔ سب نے کہا کہ بادشاہ تو آ پہنچا۔ بہتر ہے رفعِ شر کے لیے کہیں چلے ہی جائیں۔ اطمینان سے جواب دیا کہ "ہنوز دلی دُور است"[2] تاریخ شاہد ہے کہ اس عارضی عمارت کی چھت گری۔ غیاث الدین تغلق دب کر مر گیا اور دہلی پہنچنا اسے نصیب ہی نہ ہوا۔

---

[1] سیر العارفین ص ۱۴۳، [2] حضرت امیر خسرو تالیف خان بہادر نقی محمد خاں ص ۴۷۔ چاپ ٹائمز پریس کراچی۔

جذبِ کامل

من تو شدم تو من شدی من تن شدم تو جاں شدی
تا کس نگوید بعد ازیں من دیگرم تو دیگری

امیر خسروؒ تصوّف کے کٹھن مقامات کو عبور کر کے اب اُس آخری منزل کی طرف بڑھ رہے تھے جہاں من و تُو کے سب حجاب اُٹھ جاتے ہیں۔ عہدِ علائی میں یکے بعد دیگرے ایک ہی سال میں دو صدمے پیش آئے۔ ماں اور چھوٹے بھائی کے داغِ مفارقت نے ان کے سینے کو غم سے چھلنی کر دیا۔ سینے میں غم کی دو اور شمعیں فروزاں ہو گئیں۔

ماں کے لفظ میں ان کے لیے سینکڑوں حلاوتیں پوشیدہ تھیں۔ ۴۸ سال کی عمر تک ماں سے لپٹ کر بچوں کی طرح بلک بلک کر روتے۔ فرمایا کرتے تھے، ماں کا سینہ بہشت ہے، جس میں دودھ کی دو نہریں بہتی ہیں۔ اس بہشت سے محرومی نے نڈھال کر دیا۔ اب تو چمن کا ہر پھول، پھول کی ہر پنکھڑی، بہار کا موسم، موسم کا ہر ذرّہ، زندگی کی ہر گھڑی، گھڑی کا ہر لمحہ غم کا اک مستقل پیام تھا۔ غم کی ان تاریک ساعتوں میں وہ اب تصوّف و عرفان کی آخری منازل طے کر گئے اور بقول مولوی ؎ او بمعراجِ حقائق رفتہ بود

غم کے اس اتھاہ سمندر میں ساحل کی تمنا اور بڑھی اور پکار اُٹھے ؎

روز ہا گر رفت و گو رو باک نیست
تو بمان ای آنکہ چون تو پاک نیست

شوریدہ روح کو خانقاہ کے اسی گوشۂ عافیت میں تسکین ملی۔ پابدامن ہو کر بیٹھ گئے۔ اب وہ بالکل مرشد کے رنگ میں رنگے جا چکے تھے ——— مکمل وحدتِ خیال ——— کامل یک رنگی اور ہم آہنگی سے من و تو کے سب حجاب اُٹھ گئے ، اک جذبِ کامل ؎

ہر دو بحری آشنا آموختہ
ہر دو جان بی دوختن بر دوختہ

جان اور ایمان

درباری ملازمت کے باوجود شاہوں سے اِک طُرفہ بے نیازی تھی اور احترامِ مرشد کی بناء پر شاہی احکام کو پس پشت ڈالنے میں بھی تامل نہ تھا۔ تذکروں میں منقول ہے کہ سلطان جلال الدین خلجی کو سلطان المشائخ کی زیارت و قدمبوسی کا بے حد اشتیاق تھا مگر اجازت نہ ملتی تھی۔ ایک دن بادشاہ نے امیر خسرو سے کہا کہ ظن و تخمین سے تو وہ آہوئے تاتاری۔ ہاتھ آنے سے رہا۔ اب میرا ارادہ ہے کہ بلا اجازت ہی کسی دن ان کی خدمتِ اقدس میں حاضر ہو کر قدم بوسی کا شرف حاصل کروں۔ ساتھ ہی تاکید بھی کر دی کہ دیکھنا راز افشا نہ ہو۔ مگر اب شاہِ دین کے سامنے شاہِ دنیا کی کیا وقعت تھی۔ وہ کونسا راز تھا جو پیر و مرشد سے چھپایا جا سکے۔ ان کی خدمت میں عرض کر دیا۔ وہ یہ سُن کر عازمِ پاک پتن ہو گئے۔ بادشاہ کو معلوم ہوا۔ امیر خسروؒ سے افشائے راز کی وجہ پُوچھی۔ انھوں نے صاف صاف کہہ دیا کہ آپ کی ناراضگی سے جان کا

خوف تھا مگر ان کی ناراضگی سے سلبِ ایمان کا خوف تھا۔ میں نے جان پر ایمان کو ترجیح دی۔[1] یہ جوابِ شافی سُن کر بادشاہ خاموش ہو گیا۔

نے تاج و تخت میں نے لشکر و سپاہ میں ہے
جو بات مردِ قلندر کی بارگاہ میں ہے

اب وہ مقام تھا جہاں شاہی فرمان کے علاوہ بھی ایک مقام سے اذن لینا لازمی[2] تھا۔ تذکروں میں درج ہے کہ ایک مرتبہ سلطان علاؤالدین خلجی نے حضرت شیخ شرف الدین بوعلی شاہ قلندرؒ کی خدمت میں نذرانہ بھیجنا چاہا۔ وہ بھی اولیائے نامدارِ مشائخ چشت سے تھے، حضرت سلطان المشائخ کے ہم عصر اور ایسے مست الست کہ بڑے بڑے صاحبِ کمال لوگوں کو ان کے سامنے جانے کی ہمت نہ ہوتی تھی۔

بادشاہ سمیت سب امراء کی رائے کہ سوائے امیر خسرو کے کوئی اور آدمی موزوں نہیں۔ امیر خسرو کی طرف دیکھا تو صورتِ سوال پایا۔ بادشاہ بھانپ گیا کہ اور اجازت بھی لازم ہے۔ فوراً ایک درباری امیر کو محبوب الٰہیؒ کی خدمت میں بھیجا تاکہ امیر خسرو کو جانے کی اجازت مل جائے۔ محبوب الٰہیؒ

---

[1] حضرت امیر خسرو تالیف خان بہادر نقی محمد خاں، ص ۵۶/۵۵
چاپ ٹائمز پریس کراچی۔ نیز سیر الاولیا ص ۱۳۵

[2] خسرو شیرین بیان، تالیف اقبال صلاح الدین ص ۶۹۔ میری لائبریری ۱۹۷۰

نے پہلے کچھ تامل کیا، پھر سوچ کر اجازت دے دی۔ چلتے وقت نصیحت کی کہ جو کچھ قلندرِ عاشقِ اللہ فرما دیں، اسے درست تسلیم کرنا اور کسی بات پر معترض نہ ہونا۔

امیر خسروؒ نذر سلطانی لے کر پانی پت روانہ ہو گئے اور تیسرے دن خانقاہِ قلندری میں جا پہنچے۔ اپنی آمد کی اطلاع کرائی۔ جواب ملا کہ آنے دو۔ نزدیک پہنچ کر سلام کیا، قلندر صاحب نے جواب میں کوئی لفظ ہندی کا فرمایا جس کے معنے گانے والے کے تھے۔ یہ سُن کر امیر نے پھر سلام کیا کہ یہ آپ کی عین عنایت ہے جو میری طرف خطاب ہوا ورنہ میں ایک ناچیز بندہ ہوں۔ اس پر قلندر صاحب نے فرمایا "از کلام ہای خود چیزی بگو" امیر خسرو نے اپنے مخصوص انداز اور لحنِ داؤدی میں اپنی وہ غزل سنائی جس کا مطلع اور ایک شعر یہ ہے ؎

ایکہ گوئی ہیچ مشکل چون فراق یار نیست
گر امید وصل باشد ہمچناں دُشوار نیست
چند گویندم برو زنار بندای بت پرست
برتن خسرو کدامین رگ کہ آن زنار نیست

یہ غزل سُن کر قلندر صاحب کی دلی کیفیت کو علامہ اقبال نے ایک ہی ایک ہی شعر باندھا ہے ؎

چنگ را پیش قلندر چون نواخت
از نوائے شیشۂ جانش گداخت

بہت خوش ہو کر فرمایا خوب کہتا ہے، خوش رہے گا، خوش جائے گا۔ پھر قلندر صاحب نے بہ نفسِ نفیس یہ اشعار پڑھے ؎

دیہیم خسروان بر نعل اشتر است | خردکسی که حلقهٔ تجرید بر سر است
عقل کل ہست علم لدنی بعارفان | این عقل و علم جسمی و رسمی محقر است
سیمرغ داد روی نہفتم بقافِ عشق | کو عارفی که منظر او عرش اکبر است
درس شرف بنود ز الواح ابجدی | لوح جمال دوست مرا او برابر است

یہ اشعار سنتے ہی امیر خسرو پر رقّت طاری ہوگئی رونے لگے، فرمایا: کچھ سمجھا بھی۔ عرض کیا جانِ عالم رونا اسی کا ہے کہ کچھ نہیں سمجھا۔ یہ سُن کر قلندر اور بھی خوش ہوئے۔ نذر شاہ قبول کر لی اور کہا کہ اگر خواجہ نظامُ الدّین اولیأ محبوبِ الٰہیؒ کا قدم درمیان میں نہ ہوتا تو میں ہرگز قبول نہ کرتا۔ تین دن بعد اعزاز و اکرام سے جانے کی رُخصت دے دی۔ دو خط، ایک بنامِ شاہ اور دُوسرا بنامِ محبوبِ الٰہی لکھ کر امیر خسرو کے حوالے کیے اور رخصت کیا۔

ای گل بتو خورسندم که تو بوی کسی داری

اب قُرب و بُعد کے سب فاصلے سمٹ چُکے تھے، فنا فی الشیخ ہو چکے تھے۔ دوری میں بھی حضوری کا سماں تھا۔ شہرِ شاہ اور خانقاہ سے آنے والے کو بوئے پیراہانِ یوسف ہی سے پہچان لیتے۔

ایک[1] دفعہ ایک درویش حاضر ہوا۔ اتفاق کی بات کہ خانقاہ میں اُس وقت کوئی چیز موجُود نہ تھی۔ سب فتوحات تقسیم ہو چکی تھیں۔ فرمایا، جو کچھ آج آئے گا، وہ تمھارا۔ خدا کا کرنا ایسا ہوا کہ اس روز کچھ بھی نہ آیا۔ فرمایا کہ کل جو خدا بھیجے گا، وہ تمھارا۔ اتفاق کی بات کہ دوسرے دن بھی کوئی نذرانہ نہ آیا۔ آپ نے اپنی نعلین اٹھا کر اسے دے دیں۔ وہ بچارہ آزردہ ہی گیا۔ وہ

---

[1] تذکرہ حضرت امیر خسرو تالیف قدسی نظامی ص ۱۴۰۔ دہلی پرنٹنگ ورکس، ۱۹۵۲

جارہا تھا کہ دہلی سے کسی دُور دراز مقام پر امیر خسروؒ سے ملاقات ہوگئی۔ امیر کے ساتھ اور بھی بہت کچھ سامان اور لگیے بندھے تھے، اسے ملتے ہی کہنے لگے:

"مرا از تو بوی پیر روشن ضمیر خودمی آید شاید کہ از شیخ نشانی نزد خود داری"

کہو کہاں سے آئے ہو۔ اُس نے جواب دیا دہلی سے آرہا ہوں۔ کہا سلطان جی ملے؟ کہاں ہاں ملا، اتنا سفر کرکے گیا اور بس جُوتیاں دے دیں۔ فرمایا ہمیں دے دو۔ سب کچھ لے لو، فقیر نے کہا بابا مذاق نہ کرو۔ آپ کے پاس ایک قصیدہ کے صلے میں ایک کثیر رقم تھی جو بادشاہ نے دی تھی، وہ سب فقیر کو دے کر نعلینِ شیخ لے لیں۔ عمامہ میں باندھ کر سر پر رکھ لیں۔ پیدل دہلی پہنچے۔ خانقاہ میں داخل ہوئے تو محبوبِ الٰہی نے فرمایا وہ چیز بڑی سستی ہاتھ آگئی۔ عرض کیا اگر میری جان کے عوض بھی مجھ کو یہ چیز مل جاتی تو میں اس کو سستی ہی سمجھتا۔

من قبلہ راست کردم بر طرف کجکلاہے

سلطان المشائخ اپنی خانقاہ کے ایک کوٹھے کی چھت پر سے دریائے جمنا کا نظارہ دیکھ رہے تھے۔ امیر خسرو بھی موجود تھے۔ ہندوؤں کو اشنان اور پوجا کرتے دیکھ کر شیخِ کامل نے فرمایا۔ "ہر قوم راست راہے دینی وقبلہ گاہے" اتفاق کی بات کہ اس وقت آپ کی ٹوپی ذرا ترچھی تھی، اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے امیر خسرو نے اسی شعر کا دوسرا مصرع پڑھا ؎

من قبلہ راست کردم بر طرف کجکلاہے[1]۔

---

[1] یہ شعر امیر حسن دہلوی کا ہے۔

دیکھنا تقریر کی لذت کہ جو اس نے کہا

صوفیا کے نزدیک ساری مخلوق خدا کا کنبہ تھی۔ انھیں تو سب کو پیغامِ حق سنانا تھا مگر کس زبان میں؟ ع "زبانِ یارِ من ترکی و من ترکی نمی دانم" ہندوؤں اور مسلمانوں میں زبانوں کے اختلاف کی، وجہ سے اجنبیت کے دبیز پردے پڑے ہوئے تھے۔ ان کے دلوں میں شمعِ ہدایت روشن کرنے کے لیے ہمدلی ضروری تھی۔ ہم دلی کے لیے ہم خیالی لازمی ہے، اور ہم خیالی کے لیے ہم زبانی پہلا زینہ اور قرینہ ہے۔ ہم آہنگی تو بہت بعد کی بات ہے۔

ایک دن امیر خسرو سے ان کا تازہ کلام سُن کر محظوظ ہو رہے تھے۔ پھر یک دم ارشاد ہوا: تم ہندی زبان میں بھی شعر کہا کرو، درویش کا تکیہ تو سب کے لیے کھُلا ہے، لہٰذا نہایت ضروری ہے کہ ہم بھی اس خطّے کی زبان سیکھیں۔ ان کی بول چال کی طرف راغب ہوں، عوام تک پیغام پہنچا سکیں اور آپس میں جو اجنبیت اور مغائرت ہے، دُور ہو سکے۔ امیر خسروؒ نے عرض کیا، غلام نے مخدوم کے حکم پر پہلے ہی عمل کرنا شروع کر رکھا ہے۔ یہ کہہ کر کچھ ہندی اشعار سُنائے اور محبوبِ الٰہیؒ کے چہرے پر مسکراہٹیں پھیل گئیں۔ فرمایا تم ہمارے محرمِ اسرار ہو۔

صد حیف کہ امیر خسرو کا ہندی کلام سارے کا سارا تباہ و برباد ہو گیا، وہ تو فقط ارشاد کی تعمیل تھی ورنہ فارسی شاعری کے آگے اس کی کیا وقعت۔ اس وقت کی ہندی شاعری کا بالکل ابتدائی دَور تھا، اس میں دلکشی ضرور تھی مگر شکوہِ فارسی نہ تھا۔ نمکینی ضرور تھی مگر فارسی جیسی شیرینی نہ تھی۔ خود گلچیں کی اپنی نظر بھی اس پر گلدستہ بنانے کی غرض سے نہ پڑی ہوگی لہٰذا اس کا تلف

ہو جانا اچنبھے کی بات بھی نہیں ہے۔ تھوڑا بہت ہندی کلام جو زمانے کی دست برد سے بچا، وہ بھی اب تقریباً ناپید ہے۔ مگر آج بھی جب مزارات پر محفل سماع برپا ہوتی ہے تو قوال اکثر ان کی ہندی نظموں سے شروع کرتے ہیں اور قوالی کو ختم ان کی اس ہندی نظم پر کرتے ہیں جو موسیقی کی اصطلاح میں "رنگ" راگ کہلاتا ہے ؎

آج رنگ ہے ماہا رنگ ہے
ایسو پیر پایا نظام الدین اولیا ر
جگ اجیاروں میں تو ایسا رنگ اور نہیں دیکھو ری
دیس بدیس میں ڈھونڈ پھری ہوں
تورا رنگ من بھایو رے
نظام الدین اولیا آج رنگ ہے۔ ماہا رنگ ہے

دیگر

چھاپ[1] تلک سب چھینی رے، موسے نیناں ملا کے
نیناں ملا کے، سینا لڑا کے، اپنی سی کر لینی رے
موسے نیناں ملا کے
چھاپ تلک سب چھینی رے، موسے نیناں ملا کے
ارے متوالی کر لینی رے، موسے نیناں ملا کے

---

[1] حضرت امیر خسرو تالیف خان بہادر نقی محمد خاں خورجوی ص ۸۰
چاپ ٹائمز پریس کراچی

خسرو نظام کے بل بل جاؤں موہے سہاگن کینی رے
موسے نیناں ملا کے، چھاپ تلک سب چھینی رے
موسے نیناں ملا کے [1]

محبوب الٰہیؒ سے جذبِ کامل کو اس ہندی دوہے کی گہرائیوں میں تلاش کیجیے:-

خسرو رین سہاگ کی جاگی پی کے سنگ
تن میرو من پیو کو دوؤ بھئے اِک رنگ

ان کی نظر میں شوکت جچتی نہیں کسی کی
آنکھوں میں بس رہا ہے جن کی جلال تیرا

اب جذبِ کامل کا یہ حال ہے کہ تجدیدِ بیعت کے بعد

کی تمام تصانیف میں حمد و نعت کے بعد شیخ کی عظمت و بزرگی اور کشف و

---

[1] "الوارث" کراچی نے اپنی فروری ۱۹۷۵ کی اشاعت میں صفحہ ۲۱ پر ہندی بھاشا کے عنوان تلے سات اشعار درج کر کے "ادارہ" نے لکھا ہے کہ ریڈیو۔ ٹی۔ وی والے انھیں امیر خسرو سے منسوب کرتے ہیں حالانکہ یہ حضرت بیدم وارثی کے فکرِ سخن کا نتیجہ ہے۔

یقیناً یہ حضرت بیدم وارثی ہی کے رشحاتِ قلم ہوں گے۔ ہم نے یہاں فقط وہی دو شعر درج کیے ہیں جسے تذکرہ نویسوں اور محققوں نے امیر خسروؒ سے منسوب کیا ہے۔ ان میں دوسرا شعر "خسرو نظام کے بل بل جاؤں" تو کسی تبصرے کا محتاج نہیں۔ باقی رہا پہلا شعر، اس کا بھی فقط مصراعِ اولیٰ مشترک ہے اور یہ نہ کوئی نئی بات ہے اور نہ مقامِ تعجب کہ اسی پہ حضرت بیدمؔ نے تضمین لگائی ہو۔ بڑے بڑے شاعروں نے متقدمین اور متوسطین کے اشعار پر تضمین لگا کر عین اسی رنگ، اسی بحر و ردیف اور قافیہ میں بہت کچھ لکھا ہے۔ بیدم وارثی خود صاحبِ حال بزرگ اور شاعر تھے۔ انھوں نے اس خوبی سے تضمین کو نبھایا ہے کہ پہچان ہی مشکل ہے کہ ایک نے کہاں چھوڑا اور دوسرے نے کہاں سے پکڑا۔

کرامات کا ذکر جمیل بادشاہ وقت سے پہلے آتا ہے۔ اُس وقت کے مطلق العنان بادشاہوں کو ذہن میں رکھیے تو یہ خطرناک حد تک بے باکانہ اقدام تھا مگر شہرِ تمنا کا وہ رہرو سب خطروں سے بہت دور جا چکا تھا۔ ع "چو دل غمگین عشق آمد زغم ہا جملہ بی غم شد" خوف طوالت سے ہم محض چند ایک مثالوں پر اکتفا کرتے ہیں۔ شائقین حضرات خود دیوان کی طرف رجوع فرمائیں۔ ملاحظہ ہو:

یارب آن معنی کہ در کام محمد[1] ریختی
جرعہ ای برمن چکان وبوئے زان برمن رسان[2]

پناہ جہان دین حق را نظام — رہِ قدس را پیشوائے امام
بہ حجت مسیحی در آخر زماں — بر اہل زمین حجت آسمان
جہاں زندہ از جان بیدار اُو — زمین روشن از روز بازار اُو
ہمہ شب زشب خیزیٔ بی ریا — کمند افگن کنگرِ کبریا
زظلمات شب کردہ کحل البصر — بہ نظارۂ غیب صادق نظر
زبس سجدہ کردن، بہ محراب دین — شدہ حاجت حاضر عین الیقین
قدم گاہش از پایۂ عرش پیش
کف پایش از بوسۂ خلق ریش

(نامہ اسکندر) (سکندر نامہ خسروی)

علاؤالدین خلجی جیسے مطلق العنان بادشاہ سے سعدی کے انداز اور نصیحت کے پیرائے میں تخاطب ہوتا ہے ؎

چون خدایت سریر شاہی داد — ملکت از ماہ تا بماہی داد
کوش کاسودہ داری از شاہی — عالمی را ز ماہ تا ماہی

---

[1] خواجہ محبوبِ الٰہیؒ کا نام نامی [2] دیباچہ دیوان وسط الحیوۃ

یہ خواجہ ہی کے فیضانِ نظر کا لیا دیا تھا کہ مدح گو خسروِ شاہی اعزازات کے باوجود سلوک کی طویل اور کٹھن راہوں کو طے کر کے زمان و مکان کی قیود سے آزاد ہو کر ایسی منزل پہ پہنچ گیا ہے جہاں اس کی خوابوں کی دنیا بھی نورٌ علیٰ نور تھی اور جہاں وہ سراپا عجز و نیاز بن کر جمالی انداز میں پکار اُٹھتا ہے ؎

نمیدانم چہ منزل بود شب جائیکہ من بودم
بہر سُو رقصِ بسمل بود شب جائیکہ من بودم

اور پھر آخر جلال میں آ کر حجاب اٹھا دیتا ہے ؎

خُدا خود میر مجلس بود اندر لامکاں خسرو
محمدؐ شمعِ محفل بود شب جائیکہ من بودم

عشق ازیں بسیار کرد دست و کُند

محبوبِ الٰہی سے جذبِ کامل نے عشقِ الٰہی کی ایسی سوزش پیدا کر دی تھی کہ اکثر و بیشتر تذکرہ نویسوں نے لکھا ہے کہ سینہ کا کپڑا ایسا ہو جاتا تھا کہ گویا جل گیا ہے۔ عشق معجز نما سے یہ کچھ بعید نہیں

ع عشق ازیں بسیار کرد دست و کُند

مگر عقل کی عینک سے دیکھنے والوں کی سمجھ میں یہ بات مشکل ہی سے آئے گی اور وہ بھی سچے ہوں گے کیونکہ

ع در نیا بد حال پختہ ہیچ خام

وارداتِ قلبی

بادۂ وحدت کا مستانہ اور شمعِ محبوبِ الٰہیؒ کا پروانہ امیر خسروؒ بیخود ہوکر والہانہ انداز میں اپنے شعر کے محرک اور محور کی نقاب کشائی کر دیتا ہے ؎

چو کمال صنع بی چون ز جمال تُست پیدا
نتواں حدیثِ عشقت برہِ مجاز کردن

کتنے عجز و نیاز سے اعتراف کیا ہے کہ حیف ہے اس زندگی پہ جو آپ کے قدموں سے دور گذری۔ زندگی سے مراد وہی گھڑیاں ہیں جو آپ کی صحبت میں کٹ رہی ہیں ؎

باعمت خوش بودم امشب گرم در زاری گذشت
یاد میکردم از آن شبہا کہ درباری گذشت
ماجرا ای دوش پرسیدی کہ چون بگذشت حال
ای سرت گردم چہ می پرسی بدشواری گذشت

راز و نیاز کے چونچلے ملاحظہ ہوں کہ رات رات بھر کے مراقبے کی وجہ سے محبوبِ الٰہیؒ کی آنکھیں سُرخ رہتی تھیں جیسے ہلکا سا خمار ہو۔ انہی خمار آلود آنکھوں کی کیفیت کو اس عاشقانہ انداز میں والہانہ طور پر باندھا ہے کہ شعر جوہرِ سیال نظر آتا ہے ؎

تو شبانہ می نمائی بہ بر کہ بودی امشب
کہ ہنوز چشمِ مستت اثرِ خمار دارد

جن کے قدموں پر اپنا علم وفضل، فلسفہ و دانش، سبھی کچھ نچھاور کر دیا۔ وہ کیا تھے اور کیا نہیں تھے، "حدیثِ جاناں" جان کی زبان سے سنیئے ؎

آفاق ہا را دیدہ ام مہرِ بتاں ورزیدہ ام
بسیار خوباں دیدہ ام لاکن تو چیزی دیگری

خسرو غریب است وگدا افتادہ در شہر شما
باشد کہ از بہر خدا سوئی غریباں بنگری

تصورات و تخیلات کی دنیا میں مُرید اور مُرشد کے درمیان چند عاشقانہ اور عارفانہ سوال وجواب ملاحظہ ہوں ؎

گفتم کہ روشن از قمر گفتا کہ رخسار من است
گفتم کہ شیریں از شکر گفتا کہ گفتار منست

گفتم کہ مرگ عاشقاں گفتا کہ درد ہجر من
گفتم علاجِ زندگی گفت کہ دیدار منست

گفتم کہ حوری یا پری گفتا کہ من شاہ جہاں
گفتم کہ خسرو ناتوان گفتا پرستار منست

محبوب کی آمد آمد کا شور ہے، طالب کس ذوق وشوق، کس جذب وحال، کس سوز وگداز اور کس شور و ہیجان سے اس کے استقبال کے لیے مُنتظر ہے۔ اس کے ہجر و فراق میں انتظار کی گھڑیاں جتنی طوفانی ہیں، اتنی ہی طولانی بھی۔ ؎

خبرم رسید امشب کہ نگار خواہی آمد
سر من فدای راہت کہ سوار خواہی آمد

ہمہ آہوانِ صحرا سر خود نہادہ بر کف
بامید اینکہ روزی بشکار خواہی آمد

کششی کہ عشق دارد نگذاردت بدینسان
بہ جنازہ گر نیائی بمزار خواہی آمد

بہ لبم رسید جانم تو بیا کہ زندہ مانم
پس از آن کہ من نمانم بچہ کار خواہی آمد

بیک آمدن ربودی دل و دین و جانِ خسرو
چہ شود اگر بدینسان دو سہ بار خواہی آمد

دردِ دل بھی اسی نے دیا ہے۔ چارہ ساز بھی وہی ہے۔ دل کی دنیا میں تہلکہ بھی اسی کے دم سے ہے اور سکون بھی اسی کی بدولت۔ دل کی دنیا کو ویران بھی اسی نے کیا ہے اور پھر اس خرابہ کو آباد کرنے والا بھی وہی ہے ؎

جان ز تن بردی و در جانی ہنوز — درد آوردی و در مانی ہنوز
ملکِ دل کردی خراب از تیغ ناز — اندریں ویرانہ سلطانی ہنوز
ہر دو عالم قیمت خود گفتہ ای — نرخ بالا کن کہ ارزانی ہنوز

کس عجز و نیاز، دردمندی و نیازمندی سے درویش وار دعا بھی دی ہے اور ایک تمنا بھی کی ہے جس کے لفظ لفظ سے عشق و محبت کے چشمے ابلتے نظر آتے ہیں ؎

بخوبی ہم چو مہ تابندہ باشی — بملک دلبری پایندہ باشی
من درویش را کشتی بغمزہ — کرم کردی الٰہی زندہ باشی

زقید دو جہاں آزاد گردم
اگر تو ہمنشین بندہ باشی

اِسی تصویر کا دوسرا رُخ

آں یکی را روی او شد سوی دوست و ایں یکی را روی او خود روی اوست

اس جذبِ کامل کو تذکرہ نویسوں نے ان الفاظ میں بیان کیا ہے :
"کہ این ہر دو یک جان در دو قالب، یک رُوح در دو تن، چون یک ماہ در دو خانہ
و یک بادہ در دو پیمانہ بودند" خود خواجہؒ نے ایک شاعر اور ادیب کے لحاظ سے
امیر خسرو کی تعریف میں یہ رُباعی کہی [1]

خسرو کہ بہ نظم و نثرش کم خاست ملکیت ملک سخن آن خسرو راست
آن خسرو ماست ناصر خسرو نیست زیرا کہ خدائے ناصر، خسرو ماست

ہر چہ از دستِ تو آید خوش بود

امیر حسن دہلوی کے فوائد الفواد کے تتبع میں امیر خسرو نے بھی افضل الفوائد لکھنی شروع کی۔ چند اوراق لکھ کر خواجہ کو دکھائے تو فرمایا "خوب کام اور عمدہ نام ہے"۔ مزید لکھنے کی اجازت دیتے ہیں اور جہاں کہیں کوئی بات رہ گئی تھی، اپنے دست حق پرست سے تصحیح اور زبانِ حق بیان سے تعریف

---

[1] ہفت اقلیم

بھی کرتے جاتے ہیں اور اظہارِ تعجب بھی کہ یہ بات قابلِ فخر ہے کہ خسرو نے اتنی باتیں یاد رکھیں اور لکھیں حالانکہ وہ ہمہ وقت سر سے پاؤں تک بحرِ معانی میں غرق رہتا ہے لیکن حق تعالیٰ نے اس کے تمام اعضا کو عقل و دانش سے خمیر کیا ہے۔ وہ دن رات بحرِ حقائق میں شناوری کرتا ہے اور ہزاروں درِ معانی نکال کر لاتا ہے۔[1] امیر خسرو ہاتھ باندھ کر عرض کرتے ہیں جانِ عالم آخر یہ سب کچھ آپ ہی کا دیا لیا تو ہے۔

من از وی لعاب دہن یافتم

نفحات الانس میں مولانا جامیؒ لکھتے ہیں کہ ایک دن سُلطان المشائخ کے اشارے سے امیر خسرو حضرت خضر سے مُلاقی ہوئے اور یُمن و برکت کے لیے لعاب دہن کی خواہش کی۔ حضرت خضر نے فرمایا یہ دولت و سعادت تو شیخ سعدیؒ کی قسمت میں تھی جو انھیں مل گئی۔ خسرو دل شکستہ ہوئے۔ جب خواجہؒ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو سارا ماجرا بیان کیا۔[2] آپ نے فوراً اپنا لعابِ دہن عطا کیا اور برکت ظاہر ہے۔ امیر خسرو فخریہ طور پر کہتے ہیں[1]

من از وی لعاب دہن یافتم — کہ زین گونہ آب سخن یافتم
زلالم کہ خضر آب جوی ولیست — بدان زندہ ام چون زجوی وی است

دو قطرہ کزان در دوات افگنم
بظلمت در آب حیات افگنم

امیر خسروؒ کے کلام سے ان کی سماع کی محفلیں گونجتی تھیں۔ خسرو کا لحن داؤدی ان کے لیے فردوس گوش تو وجود خسروی جنت نگاہ۔ فقط شوکتِ

---

[1] افضل الفوائد، تصنیف امیر خسرو، ص ۱۰۰۔ [2] خزینۃ الاصفیا ج ۱ ص ۳۴۰

کلام ہی سے نہیں، وہ امیر خسروؒ کے رفعتِ مقام سے بھی کماحقہٗ آشنا تھے۔ ٹھیک ہے امیر خسروؒ ان کا اپنا ہی مُرید، اپنا ہی طالب اور اپنا ہی تربیت یافتہ تھا۔ مگر حسام الدین چلپی بھی تو آخر مولانا رومؒ ہی کے مُرید، اور تربیت یافتہ تھے۔ ایک وقت ایسا بھی آیا کہ ان کے دیکھے بغیر رُوح کو چین ملتا تھا نہ سکوُن، اُن کا اتنا ادب و احترام کرتے ہیں کہ حیرانی ہوتی ہے کہ اُستاد کون ہے اور شاگرد کون۔ وہ مثنوی لکھنے کی ترغیب دیتے ہیں تو کتنے پیارے انداز سے استدلال کرتے ہیں کہ اے میرے متقی دوست، تم ذاتِ باری تعالےٰ کے عاشقِ صادق ہو اور معشوق اپنے عاشقِ زار سے جُدا ہو تو کیونکر؟ میں اس آواز کو خوب جانتا ہوں اور صاحبِ آواز کو خوب پہچانتا ہوں۔ اور پھر کتنے ادب سے ان کی صدا پر لبیک کہتے ہیں کہ جیسے کہتے ہو، ویسا ہی ہوگا ؎

چون چنین خواہی خدا خواہد چُنین حق بر آرد آرزوئے متقین
بیش من آوازت آوازِ خُدا است عاشق از معشوق حاشا کی جُدا است

اب امیر خسرو کے مقام کی بلندیوں کو بھی خود انہی کے مُرشد کے الفاظ میں دیکھیے گا:-

" روزِ قیامت ہر کسی بہ چیزی نازد و نازِ من بسوز سینۂ ایں ترک اللہ است"

(یعنی بازارِ قیامت میں ہر کسی کو کسی نہ کسی چیز پر ناز ہوگا اور میرا مایۂ ناز اس ترک اللہ کے سینے کا راز)

اللہ اللہ کشف حقائق میں کیا اعلیٰ مقام پایا ہے اور مرشد کی زبانِ حق بیان سے کیسا اعلیٰ خطاب و لقب۔ خواجہ محبُوب الٰہی ہمیشہ انھیں ترک اللہ کہہ کر مخاطب فرماتے اور امیر خسرو کے لیے یہ سندِ فضیلت مایۂ صد افتخار۔ کس عجز و انکسار سے سر جھکا دیتے ہیں اور اسی خاکساری میں ان کے عرُوج کی

داستانیں پنہاں ہیں۔ ؎

بر زبانت چوں خطاب بندہ ترک اللہ برفت
دست ترک اللہ بگیر و باللہش سپار

چون من مسکین ترا دارم ہم اینم بس بود
شیخ من بس مہربان و خالقم آمرزگار

پھر حضورِ حق میں ان کی اس دعا کو ملاحظہ کیجیے اور سوچیے کہ کس کے حق میں دعا ہے، مرید کے حق میں یا خود مرشد کے اپنے حق میں ــــــ ذرا اس تمنا کو بھی جانچیے۔ اس سوز سے کیا کیا توقعات وابستہ ہیں "روزِ حشر امید دارم کہ مرا بہ سوزِ سینۂ ایں ترک بچہ بہ بخشند۔" اُس آتشِ عشق کا اندازہ لگائیے جو امیر خسروؔ کے سینے میں سلگتی ہے اور اس پس منظر میں پھر اقبال کی تمنا ع "عطا کُن شورِ رومی، سوزِ خسروؔ" کا جائزہ لیجیے۔

فرماتے ہیں کہ میں سب سے اُکتا جاتا ہوں، حتیٰ کہ گاہے اپنے وجود سے بھی۔ مگر اے ترک میں تجھ سے کبھی رنجیدہ نہیں ہوتا۔ ان کے اس شعر کو دیکھیے جو جذبِ کامل کی اک تصویرِ مجسّم ہے (اگر کہیں نوبت یہ آجائے کہ میرے سر پر تلوار لٹکا کہ مجھے اپنی جان اور اس ترک میں سے کسی ایک کا انتخاب کرنے کو کہیں تو میں جان دے دوں گا، اس کا دامن نہیں چھوڑوں گا ؎

گر برای ترکِ ترکم ارّہ بر تارک نہند
ترکِ تارک گیرم و امّا نگیرم ترکِ ترک

یہ بھی سُنیے کہ وہ بازارِ قیامت میں کون سی متاعِ گراں بہا لے کر جائیں گے، فرماتے ہیں کہ قیامت میں خدا جب مجھ سے پوچھے گا کہ نظام الدینؒ ہمارے واسطے دُنیا سے کیا لائے ہو، عرض کروں گا۔ "خسروؔ کے دل کا سوز"

پھران کی طرف اشارہ کرکے فرمایا" الٰہی بسوز سینۂ این ترک مرا بہ بخشش"

اور آخر میں ان کی وصیت پر غور کیجیے

پاسِ ناموسِ جنابِ مصطفےٰ است

جس کی نظیر تاریخ عالم میں نہیں ملتی :

" خسرو کو میرے پہلو میں دفن کرنا۔ وہ میرا محرمِ اسرار ہے۔ افسوس کہ شرع اجازت نہیں دیتی۔ اگر ایک قبر میں دو آدمیوں کو دفن کرنے کی اجازت ہوتی تو میں ضرور کہہ جاتا کہ مری لحد اتنی کشادہ رکھنا کہ خسرو بھی وہیں میرے ساتھ دفن ہو سکے " [1]

اور ان الفاظ کے بعد جذب و استغراق کی سب بحثیں ختم ہو جاتی ہیں۔

---

[1] سوانح حیات امیر خسرو تالیف ڈاکٹر محمد وحید مرزا ص : ۱۸۷ ہندوستانی اکیڈمی۔ الہ آباد ۱۹۴۹

خانقاہ کے شب و روز

اب خانقاہ محبوبیؒ مرجع خلائق ہے۔ ہر خاص و عام کے لیے صلائے عام ہے۔ علما و مشائخ، اکابر و اعاظم، وضیع و شریف، امیر و غریب، ہر طرح کے لوگ خانقاہ میں آتے ہیں اور رشد و ہدایت کی دولت سے جھولیاں بھر کر لے جاتے ہیں۔ کوئی روک ٹوک نہیں۔ نہ کسی دربان کی کڑوی کسیلی سُننی پڑتی ہے۔ نہ کسی حاجب کا منت کش احسان ہونا پڑتا ہے اور نہ ہی انتظار کی زحمت اُٹھانا پڑتی ہے ع ہر کہ خواہد گو بیا و ہر کہ خواہد گو برو

درس و تدریس کے اوقات بھی مقرر ہیں اور رُشد و ہدایت اور صلاح و مشورے کے لیے بھی۔ غموں کے مارے، دُکھوں کے ستائے ہوئے، تھکے ماندے لوگ اِدھر آتے ہیں اور ایک ایسے شاہِ بوریا نشین سے ملتے ہیں جو دُنیاوی مسرتوں سے دُور، بہت دُور اس شور و شغب سے پرے نکل چکا تھا، جو ہر کسی کی سمجھ کے مُطابق گفتگو کرتا، جس کی میٹھی میٹھی باتیں دل کی گہرائیوں میں اُتر جاتی تھیں اور جس کی تعلیمات سے ان پر یہ راز فاش ہو جاتا تھا کہ رُوح کی باطنی تعمیر دُنیاوی کاموں سے اعلیٰ و ارفع ہے۔ جو کچھ انسان کرتا ہے، وہ اتنا اہم نہیں جتنا کہ وہ خود بن جاتا ہے۔

تالیف قلوب کا درس دیا جاتا ہے۔ کائنات سے عالم گیر محبت

کر کے مسرّتِ کامل حاصل کرنے کے گُر سکھائے جاتے ہیں۔ ہر آنے والے کو چہار ترکی کلاہ اور مسواک طہارت عطا کر کے دُعا دیتے ہیں۔ فضائیں قال اللہ اور قال الرّسول کی صداؤں سے دن رات گُونج رہی ہیں۔

اب کشائش رزق کا یہ حال تھا کہ حضرت نصیرالدّین چراغ دہلویؒ اپنے ملفوظات میں لکھتے ہیں کہ " ایسا وقت بھی آیا کہ فتوحات اور نذرانوں کی عجب بھرمار تھی، دولت کا دریا دروازے کے آگے بہتا تھا، کوئی وقت نذر نذرانوں اور فتوحات سے خالی نہ ہوتا مگر اِدھر اس مردِ کامل کے استغنا کا یہ عالم کہ امرا اور شہزادوں سے ہدایا یا تحائف سے التفات ہی نہیں۔ اک آہ سرد بھر کر کہتے، یہ لوگ درویش کو غارت کرتے ہیں اور معذرت چاہتے کہ "از خواجگان ما و مشائخ ما ہیچکس ازیں قبول نکرد" اور جود و سخا کا یہ حال کہ صبح سے شام بلکہ عشا تک لوگ آتے اور جھولیاں بھر بھر کر لے جاتے۔ لینے والوں کی تعداد لانے والوں سے ہمیشہ زیادہ ہوتی اور جو کوئی کچھ لاتا، اس سے زیادہ پاتا۔ سب کچھ تقسیم کرنے کے بعد حجروں اور انبار خانوں میں جھاڑو دے دیا جاتا۔

دنیا کی کوئی چیز ان کے روزانہ معمولات میں حائل نہ ہو سکتی تھی۔ جوانی میں تیس سال تک بڑے مجاہدے کیے۔ عمر بھر صائم الدہر رہے۔ خود امیر خسرو نے بھی ان کے تتبع میں چالیس سال تک متواتر روزے رکھے۔ نماز ہمیشہ باجماعت ادا کرتے، افطار میں بھی کھانا بہت قلیل مقدار میں کھاتے۔ کھانے کے بعد اکثر شیخ تکیہ لگا کر بیٹھ جاتے اور اپنا برفِ پیری سے سفید سر بڑے مسرّت آمیز انداز میں ہلا کر پوچھتے، کہو خسرو، کیا خبریں ہیں۔ امیر خسرو جن کو شہر کی خبریں لونکِ زبان ہوتی تھیں، اپنے مرشد کو معاشرہ کے حالات سُنا کر محظوظ کرتے اور وہ بھی ایک اجنبی کی طرح بہت دلچسپی اور ہمدردی سے سُنتے رہتے۔

غذا کی طرح نیند بھی مختصر تھی۔ تھوڑی دیر دوپہر کو سنتِ پیغمبرؐ کے مطابق قیلولہ کرتے اور تھوڑی دیر آدھی رات سے پہلے سوتے۔ بس عمر بھر یہی معمول رہا کہ نمازِ عشاء اوّل وقت میں پڑھی، رات کے پہلے حصّے میں قدرے آرام کیا مگر آدھی رات کے بعد جب ساری دُنیا سوتی تھی، وہ اُٹھتے، خواب گاہ کا دروازہ مقفل کرتے۔ صبح تک پھر یہ اوقات مراقبہ، مجاہدہ، مکاشفہ، مطالعہ اور اوراد و وظائف میں کٹ جاتے۔ اپنی اس رباعی میں اسی طرف اشارہ کرتے ہیں ؎

تنہا منم و شب چراغی مونس ستارہ تا پگاہ روزم
گاہی از آہِ سرد بکشم گاہ از تف سینہ برفروزم

خلوت میں جلوت امیر خسروؒ کے لیے اس خلوت میں بھی جلوت تھی۔ نمازِ عشا کے بعد جب خواب گاہ میں تشریف لے جاتے تو اس وقت کسی کو حضوری کی اجازت نہ تھی مگر حضرت امیر خسرو کے لیے یہ حکم تھا کہ وہ جس وقت آئے، آنے دو[1]۔ چنانچہ وہ جب حسبِ معمول حاضر ہوتے، ان سے دن بھر کے درباری واقعات سُنتے، پھر ارشاد ہوتا، تازہ کلام سناؤ۔ وہ تعمیلِ ارشاد کرتے۔ اس اثنا میں آنکھ لگ جاتی۔ ادھر خسرو بھی قدموں پر سر رکھ کر سو جاتے۔ اللہ اللہ کیا نیند ہے اور کیا بیداری۔

ایک دفعہ امیر خسرو ایک سفر کے سلسلہ میں کئی مہینے اس صُحبت و سعادت سے محروم رہے۔ جب از سرِ نو یہ صحبت جاری ہوئی تو امیر خسرو نے اپنی محرومی

---

[1] تذکرہ امیر خسرو تالیف قدسی نظامی۔ ص: ۱۱ دہلی پرنٹنگ ورکس ۱۹۵۲ء

اور جدائی کا یوں اظہار کیا ؎

نخفت خسروِ مسکین از این ہوس شب ہا
کہ دیدہ بر کف پایت نہد بخواب شود

امیر خسروؔ بھی ہر شب کو مکمل قرآن پاک تلاوت کرتے، تہجد میں سات سپارے پڑھا کرتے۔ مسلسل چالیس سال تک صائم الدہر رہے۔ خواب میں پانچ مرتبہ حضور سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی بشارت کی سعادت بھی پائی۔ یہ سب کچھ لیا دیا کس کا تھا؟ اس کا جواب مولانا روم ؒ کے ان اشعار میں ڈھونڈیے گا جو جذبِ کامل کے شہنشاہ تھے ؎

ہیچ نکُشد نفس را جز ظلِ پیر — دامن آن نفس کش را سخت گیر
چون بگیری سخت آن توفیق ہُوست — در تو ہر قوت کہ باشد جذب اوست

سُبحَانَ اللہ آفتاب در زمین و خسرو زندہ

ای زہجرانت زمین و آسماں بگریستہ
دل میانِ خون نشستہ عقل و جان بگریستہ

در حقیقت صد جہان بودی نبودی یک کسی
دوش دیدم آن جہان بر ایں جہاں بگریستہ

خواجہ محبوب الہیؒ اپنے دادا پیر خواجہ معین الدین چشتیؒ کے مشن کی تکمیل کر چکے تھے۔ اب ہر سُو نورِ حق پھیلتا جا رہا تھا۔ وہ ہزاروں نہیں، لاکھوں کے دلوں میں رشد و ہدایت کی جوت جگا چکے تھے۔ ربیع الثانی ۷۲۵ھ کے آغاز میں طبیعت ناساز ہوئی اور پھر نہ سنبھل سکی، وصال سے کچھ روز پہلے حضورِ پاکؐ کی بشارت کی سعادت نصیب ہوئی۔ حضورؐ نے فرمایا تم سے ملنے کو بڑا اشتیاق ہے۔ سو کر اُٹھے۔ چہرے پر اک مسرت کی لہر تھی، ٹھہری ہوئی مسرت

ع خرم آن روز کزیں منزل ویراں بروم

خانقاہ کا پورا جائزہ لیا۔ جنس و نقد ہر شے خدا کی راہ میں تقسیم کر دی۔ چادر، عصا، سجادہ اور کشکول خواجہ نصیر الدین چراغ دہلویؒ کے سپرد کر کے

خلافت انھیں سونپی اور پا بہ رکاب ہو کر بیٹھ گئے۔ مرض الموت کی شدّت ہوئی تو معالجوں اور مریدوں نے دوا پینے کو کہا۔ مگر مریضِ عشق شوق زیارت سے ہر دوا دارو سے بے نیاز ہو چکا تھا، فرمایا ع درد مندِ عشق را دارو بجز دیدار نیست جوں جوں زندگی اور موت کا درمیانی فاصلہ سمٹتا جا رہا تھا۔ نظر کا شوق بڑھتا جا رہا تھا۔ صبح کی نماز پڑھی۔ ۱۸ ربیع الثانی کا آفتاب طلوع ہونے کو تھا کہ یہ آفتابِ دین ابد کے پردوں میں مستور ہو گیا۔ اور ان کی رُوح افق کے اُس پار زرنگار بادلوں کے پرے اعلیٰ علیّین کی اس نُورانی منزل میں جا بسی جس کے متعلق دوسرے شناسا نے تجاہلِ عارفانہ سے کام لیتے ہوئے کہا تھا کہ

ع نمیدانم چہ منزل بود شب جائیکہ من بودم

غروبِ ماہتاب

ہر کہ او از ہمزبانی شد جُدا　　بی نوا شد گرچہ دارد صد نوا
چونکہ گل رفت و گلستاں در گذشت　　نشنوی زاں پس ز بُلبُل سر گذشت

امیر خسرو ان دنوں غیاث الدّین تغلق کے ہمراہ بنگال کی ایک مہم پر تھے۔ یکایک مرشد کی یاد نے بیقرار کر دیا

ع گئی یک بیک جو ہوا پلٹ نہیں دل کو میرے قرار ہے

بادشاہ سے اجازت حاصل کی اور دلی کا رُخ کیا، تیزی سے منزلیں مارتے ہوئے دلی پہنچے تو معلوم ہوا کہ ہمارا محبوب تو محبوب حقیقی سے جا ملا۔ رنج سے وارفتہ ہو کر کپڑے پھاڑ ڈالے، منہ پر کالک مل کر خانقاہ کا رُخ کیا، اور خانقاہ کے دروازہ پر پہنچتے ہی یہ شعر پڑھا ؎

ایں مکانیست کہ منزل گہ جاناں بودست
راہ آمد شد آں سروِ خراماں بودست

لڑکھڑاتے ہوئے قدموں سے آگے بڑھے سامنے مٹّی کا ڈھیر۔ مٹّی کے اس ڈھیر میں کیا حسن و جمال، کیا زعنائی و زیبائی، کیا دلکشی و دلبری ہے۔ سر تا پا مہر و جمال، جہاں وہ باکمال انسان حیاتِ سرمدی کی چادر تانے ابدی نیند سو

رہا ہے۔ اِک آہِ جگر دوز نکلی اور فضا کی لامتناہی وسعتوں کو چیر گئی۔ فرمایا[1]

"سبحان اللہ آفتابِ درزمین وخسرو زندہ"

بے ہوش ہو کر گر پڑے۔ ہوش آیا تو ساری املاک، نقد و جنس سمیت شیخ کے ایصال ثواب کے لیے فقرا و مساکین میں تقسیم کر دیں۔ سر پر خاک ڈالی۔ منہ پر کالک مل لی۔ شدّتِ غم سے دیوانگی طاری ہو رہی تھی۔ کپڑے تار تار کر ڈالے اور ہندی کا یہ دوہا پڑھا ؎

گوری سوئے سیج پر مکھ پر ڈارے کیس
چل خسرو گھر اپنے رات بھئی چوندیس[2]

(محبوب پھولوں کی سیج پہ اپنے حسین و جمیل چہرے پر زلفیں ڈالے محوِ خواب ہے۔ خسرو، ہر سُو رات کی تاریکیاں پھیل گئی ہیں۔ تم بھی اپنے گھر چلنے کی تیاری کرو)

اب لے دے کے یہی بات وجہِ سکون تھی کہ محبوب الٰہی فرمایا کرتے تھے، خسرو میری زندگی کی دُعا کیا کرو۔ میرے بعد تم زیادہ دیر زندہ نہیں رہو گے۔ اب شامِ عمر آئی تو صبحوں میں وہ پہلا سا سرور نہ تھا۔ اب تو چاند تاروں کی ضیا باریاں بھی کم ہو گئیں۔ شاعری سے بھی دل سرد ہو گیا۔

اب دن تڑپتے کلپتے بیت رہے تھے۔ ماتمی لباس پہنا اور مجاور بن کر بیٹھ گئے۔ فقط اُس لمحہ کا انتظار تھا۔ بالآخر چھ ماہ کے اندر اندر وہ دن بھی آن پہنچا اور ۱۸ شوال ۷۲۵ھ کو امیر خسرو کی رُوح بھی اسی منزلِ جاناں پہ محبوبِ الٰہی کی رُوح سے جا ملی۔

---

[1] سفینۃ الاولیا ص : ۱۷۰، [2] جواہر خسروی ص : ۱۵۷

خواجہؒ کی وصیت تھی کہ خسروؒ کو میرے پہلو میں دفن کرنا وہ میرا محرمِ اسرار ہے۔ چنانچہ لوگوں نے بموجب وصیت پہلو میں قبر بنانا چاہی، مگر یہ اعتراض اُٹھا، کہیں ایسا نہ ہو، امتدادِ زمانہ سے خواجہ اور ان کی قبر میں تخصیص ہی نہ ہو سکے لہٰذا انھیں خواجہ صاحبؒ کی قبر کی پائنتی دفن کیا گیا۔

ع ثبت است بر جریدۂ عالم دوامِ ما ..، سال گزر گئے۔

بڑے بڑے بادشاہ اور سلطان تختِ دہلی پر بیٹھے اور اُٹھ گئے، ان کی عظمت اور شان و شوکت خواب و خیال ہو گئی۔ کتنی سلطنتیں وجود میں آئیں اور حرفِ غلط کی طرح مٹ گئیں، دہلی نے کتنے انقلابات اور کتنے تاجور دیکھے۔ یہ شہر کتنی بار اُجڑا اور آباد ہوا۔ مگر ان انقلابات میں بھی نظام الدین اولیا محبوبِ الٰہیؒ اور امیر خسروؒ کے زندہ مزار، تباہ شدہ کھنڈروں اور ویرانوں میں آباد بستی ہے۔ جو ہُوا سو ہُوا، اس بستی کی رونق اور چہل پہل میں کبھی کوئی فرق نہ آیا۔ یہ مسلموں اور غیر مسلموں کی یکساں زیارت گاہ رہی۔ آج بھی سماع کی محفلیں ویسے ہی گونجتی ہیں۔ ان کا نقشِ دوام ایسا گہرا ہے کہ گدا ہو یا شاہ ہر راہ گیر وہاں پہنچ کر ٹھٹک جاتا ہے۔ سر ادب سے خود بخود جھک جاتا ہے اور قدم رُک جاتے ہیں اور رُوح چلّا اُٹھتی ہے ؎

پایم بہ پیش از سرِ ایں کُو نمی رود
یارانِ خبر دہید کہ ایں جلوہ گاہ کیست

زمانے کی آواز

یا

وقت کا فیصلہ

اب اس جذبِ کامل کو ذرا معیار کی آخری کسوٹی پر پرکھ لیجیے:

زمانے کی آواز سب سے بڑی آواز ہے اور وقت کا فیصلہ، سب سے اہم فیصلہ

موت بھی تو اُن کو جُدا نہ کرسکی، وہ مرکر بھی اکٹھے ہیں اور جو قرب، جذب اور خصُوصیت مُرید کو زندگی میں حاصل تھی، وہ ۷۰۰ سال گزرنے کے بعد بھی باقی ہے اور آج بھی ارادت مند زائر اپنے دل کی مُراد خسروؔ ہی کے توسّل سے خواجہ محبوبِ الٰہی کے حضُور میں پیش کرتا ہے اور ان کے مزار پر جانے سے پہلے عقیدت اور ارادت مندی کے پھُول امیر خسرو کے مزار پر چڑھاتا ہے اور ہوا کے ایک ہی ہلکے سے جھونکے سے دونوں کے مزاروں کی اگربتیوں کے دُھوئیں اور ان کی بھینی بھینی خُوشبو آپس میں گھُل مِل جاتے ہیں ؛

742
14.